Name of Book:... "KHALISH-E-NARASA"

Name of poet:--- "SHAFI IQBAL.

First publication

Journalist: Editor: "HAMARI MANZIL" Urdu weekly.

Gen. Sec:... "IDARA-E-ASRI ADAB".

Poet, writer & social worker.

Address: "HILLCOTTAGE" 13-1-1235/309. Jhirra, P.O. Kulsoom pura, Hyderabad. 500267.

PRICE: Rs. 30/-

خلشِ نارسا

شفیع اقبال

زیرِ اہتمام: "ہماری منزل پبلیکیشنز" حیدرآباد - ۵۰۰۰۲۷،



سنہ اشاعت جولائی ۱۹۹۳ء

اشاعت بارِ اوّل

نام کتاب خلشِ نارسا

نام مصنّف شفیع اقبال بی۔اے (عثمانیہ)

سرِ ورق محمد یوسف ٹائیٹل: فیمس بلاک۔

کتابت ادارہ ادبی مرکز۔

طباعت اعجاز پرنٹنگ پریس۔ چھتہ بازار۔ حیدرآباد

تعدادِ اشاعت ۵۰۰ (پانچ سو)

جُزوی تعاون۔ اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش حیدرآباد

قیمت : ۳۰ روپے

زیرِ اہتمام: "ہماری منزل پبلیکیشنز" حیدرآباد۔ (اے۔پی)

مصنّف کا پتہ: "ہل کاٹیج" چھترہ۔ پوسٹ کلثوم پورہ۔ حیدرآباد ۲۶۷-۵۰۰

ملنے کے پتے

○ اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش، 637-4-11، اے۔سی۔گارڈ۔ حیدرآباد۔

○ ادبی مرکز۔ اعجاز پرنٹنگ پریس۔ چھتہ بازار۔ حیدرآباد۔ ۵---۲

اِنتِساب

والدِ محترم سیّد محمد وزیر صاحب آوازؔ مرحوم

کے نام

جنہوں نے راسخ عقیدہ، بلند کردار، رموزِ حیات،
علم و ادب اور شاعری کا شعور بخشا۔

ڈاکٹر بشیر بدر

○ شفیع اقبال ایسے ادبی خاندان کے شاعر ہیں جن کے یہاں اکثر لوگوں کو شعر و سخن سے عملی طور پر دلچسپی رہی ہے۔ شفیع اقبال ۱۹۵۶ء سے نہ صرف یہ کہ شعر کہہ رہے ہیں بلکہ ملک اور بیرونِ ملک کے جرائد و رسائل میں چھپ بھی رہے ہیں۔ ریڈیو سے بارہا ان کا کلام نشر ہو چکا ہے۔ اور ٹی۔وی۔ پر بھی آچکے ہیں۔

تقریباً ۳۰ سال کے فکر و سخن کے بعد انہوں نے اپنا شعری مجموعہ ترتیب دیا ہے۔ موضوعاتی اور تہنیتی نظموں کو چھوڑ کر ان کی نظموں میں معصوم استعجاب کا خوبصورت منظرنامہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے اِرد گرد کی معمولی چیزوں اور واقعات سے غیر معمولی نظمیں تخلیق کرتے ہیں۔

غزل میں ان کا فن حُسن کے سراپا اور عشق کی داخلی کیفیات میں جھلکتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ وہ جو بات کہتے ہیں اسے دل سے اس اُسلوب میں کہتے ہیں کہ سُننے والا اگر صاحبِ دل ہے تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ان کی کئی غزلیں حدیثِ زلف و رخسار اور آیاتِ چشم و ابرو ہیں۔ انہیں خوبصورت خالص عشقیہ شعروں کے درمیان کچھ ایسی محویت آمیز اشعار مل جاتے ہیں جن کا سلسلہ تصوف کی پاکیزگی اور سنجیدگی سے جوڑا جا سکتا ہے۔ اور کچھ اشعار میں حکایتِ روزگار بھی شعری نغمہ بن گئی ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ ان کے مجموعے کو اہلِ دل اور اہلِ نظر قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

ڈاکٹر بشیر بدر
A-1، بلد شاہ اپارٹمنٹ۔ کوہِ فضا ہ۔ بھوپال۔ (ایم۔پی)

۲۴ر اپریل ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر علی احمد جلیلی

میری نظر میں ——

*

حالی کے بعد غزل کی شاعری کم نظر سے دیکھی جانے لگی اور جذبات نگاری کو وہ اہمیت دی گئی جو اس سے پہلے اُردو شاعری میں برائے نام تھی۔ یہ ایک معاشرتی صورت کے تجزیہ کا تقاضہ تھا۔ چنانچہ شعر و ادب میں پرانی شعریات کے خلاف ایک مسلسل بغاوت کا عمل شروع ہوا۔ پھر کئی پیچ و خم اور تحریکات و تجربات سے گزرتی ہوئی آج کی غزل ہمارے سامنے آئی۔

اس تناظر میں غزلیہ شاعری کا سفر نئی اور پرانی غزل کے روپ میں آج بھی بڑے بانکپن کے ساتھ جاری ہے اور غزل کے معنوی اور داخلی تنوع میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ غزل کا سرمایہ آج اُردو کی پہچان بنا ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ شفیع اقبال نے بھی صنفِ غزل کو اپنی فکر کا مرکز بنایا ہے اور زیادہ توانائی اسی پر صرف کی ہے۔ ساتھ ساتھ اُنھوں نے نظم پر خاصی توجہ دی ہے۔ جن مضامین کو وہ غزل میں نہیں سمو سکتے تھے انہیں نظموں کا لباس دے دیا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ "خلشِ نارسا" ان کی اسی مجموعی کاوش کا مظہر ہے۔

شفیع اقبال کو نہ صرف حیدرآباد کا ادبی و شعری ماحول ملا بلکہ شاعری ورثہ میں بھی پائی ہے۔ اِن کے والد محمد وزیر آدؔ آپ سے میں بخوبی واقف ہوں جو اُستاد جلیل کے ارشد تلامذہ میں تھے اور اکثر جلیل منزل تشریف لایا کرتے تھے۔ اس شعری ماحول میں شفیع اقبال نے آنکھیں کھولیں اور اِسی فضاء میں ان کی شاعری کو پر پرواز لگے۔

کلام کا مطالعہ بتاتا ہے کہ شاعر نے کلاسیکیت و رومانیت سے اپنا رشتہ نہیں توڑا ہے۔ درحقیقت کلاسیکی غزل کی جڑیں اپنی رسمیات کے ساتھ ہماری تہذیب

اور جذباتی زندگی کی گہرائیوں میں ایسی پیوست ہیں کہ غزل خواہ کسی دور میں کہی جائے بنیادی طور پر احساسِ جمال اور جمالیاتی اظہار کے بغیر چارہ نہیں۔ شفیع اقبال نے بھی غزل کی صالح روایت کو آگے بڑھانے اور اس کی توسیع سے خود کو آراستہ کر رکھا ہے۔ ان کے وہ اشعار جو غزل کی رومانیت کے دین ہیں اس جانی پہچانی لذّتیت سے آشنا کرتے ہیں جسے تغزل کہا جاتا ہے۔ لیکن آج جبکہ کوئی موضوع غزل کے لئے شجرِ ممنوعہ نہیں رہا ہے شفیع اقبال نے زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی نظر ڈالی ہے، خارجی حالات کا جائزہ بھی لیا ہے اور عہد کی اُلجھنوں کو بھی محسوس کیا ہے جو داخلی اضطراب کی صورت میں ان کے شعروں میں جھلکتا ہے۔ نئے عناصر سے ارتباط کے رجحان نے غزل کو نیا پیرہن دینے کا احساس ان میں اُبھارا ہے۔ اس کوشش میں شفیع اقبال زیادہ آگے تو نہیں بڑھے البتہ متوازن لہجہ کو فکر و نظر کے سامنے رکھ کر بڑی کامیاب ترجمانی کی ہے۔

شفیع اقبال کی شاعری خطِ مستقیم کی شاعری ہے جو بغیر کسی اُلجھاؤ کے قاری کے دل و دماغ تک پہنچ کر اُسے لذت آشنا کرتی ہے۔ غزل کہنے کا جو سلیقہ اُنہیں ملا ہے اس سے خاصا استفادہ کیا ہے۔ جہاں تک آج کی غزل کے اسلوب کا تعلق ہے اس کی تبدیلی نئی لفظیات کا مطالبہ کرتی ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ نِت نئے موضوعات کی ترجمانی کے لئے شفیع اقبال ایسے الفاظ، علامتوں اور استعارہ کی طرف توجہ کریں جو نئی غزل کا مزاج بن رہے ہیں۔ علاوہ ازیں آج کے شاعر کو اس بات کا بھی جواب دینا ہے کہ غزل آجتک جو دینا تھی دے چکی اب اس کے پاس اور دینے کے لئے کیا بچا ہے؟

[illegible] اور غزل کا باہمی کوئی ٹکراؤ نہیں تاہم فرق یہ ہے کہ نظم ایک خاص فرد کے محسوسات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ شخصی تاثرات کی نشاندہی کرتی ہے۔ برعکس اس کے غزل میں شخصی تصوّرات، مجموعی تصوّرات میں ڈھل کر عمومیت کی سطح اختیار کر لیتے ہیں۔ شفیع اقبال نے نظم کو اس لئے بھی اپنایا ہے کہ وہ جزوِ سماج

بننے کی صلاحیت زیادہ رکھتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کے موضوعات متنوع ہیں ۔ رومانی ، قومی ، سیاسی ، سماجی اور شخصی بھی ۔ ہیئت کے اعتبار سے زیادہ نظمیں آزاد ہیں اور پابند نظمیں کم ۔ ان نظموں کے لہجہ میں نیا پن بھی ہے اور تیکھا پن بھی ۔

مجموعی طور پر شفیع اقبال اپنی شاعری کا سفر بڑی خود اعتمادی سے طئے کر رہے ہیں ۔ شاعری کی کوئی منزل نہیں ہوتی ، ایک منزل دوسری منزل کی نشاندہی کرتی ہے اور یہ سفر جاری ہی رہتا ہے ۔ شفیع اقبال کو ابھی اور بہت سی منزلیں طئے کرنی ہیں ۔ مجھے توقع ہے کہ ان کی یہ پہلی کاوش " خلشِ نارسا " اربابِ ذوق کو اپنی طرف متوجہ کرے گی ۔ ••

۱۲ جولائی ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر علی احمد جلیلی
" جلیل منزل " سلطان پورہ ۔
حیدرآباد ۔ (اے ۔ پی)

ڈاکٹر طیب انصاری

خلشِ نارسا

رچرڈز نے ایک بنیادی بات کہی ہے۔ اُس نے کہا کہ فنون ہماری اقدار کے ذخیرے ہیں۔ اس طرح اُس نے ابلاغ و ترسیل کے ساتھ ساتھ قدر کو بھی اہمیت دی ہے۔ کوئی بھی فن ابلاغ کے بغیر بہرہ، گونگا اور اندھا ہے یا پھر وہ بازیچۂ اطفال ہے۔ ایک فنکار قاری کی پرواہ کئے بغیر اگر گنجلک، بے معنی اور بے ہنگام لفظوں کے پیکر تراشتا ہے اور اس کو فنکاری کا نام دیتا ہے تو محض یہ اس کا بہکاوا ہے یا پھر یوں کہیئے کہ وہ بہک گیا ہے۔ پچھلے چند دہوں میں ہمارے یہاں بھی کچھ ایسا ہی ادب "تخلیق" ہوتا رہا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس طرح کے فن کو عصری تقاضوں کا آئینہ قرار دیا گیا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد حال حال تک بھی بے تکی شاعری کو بھی اور افسانہ کو بعض ترم خاں ایسے نقادوں نے بڑی اہمیت دے رکھی تھی۔ اب وہ نشہ سارا اُتر گیا۔ اُردو ادب میں اس طرح کی بے راہ روی ممکن بھی نہ تھی۔ اُردو ادب زمانۂ قدیم سے بعض اقدار اور اُصولوں کا پابند ہے۔ خصوصاً اس کا رشتہ قاری سے بہت مضبوط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جدیدیوں نے یہ دیکھا کہ ان کے فن کو قاری خاطر میں نہیں لا رہا ہے تب انہیں اُلٹے پاؤں قدماء کے راستے پر آنا پڑا۔ سچ تو یہ ہے کہ پچھلے تین دہوں میں جو ادب تخلیق ہوتا رہا ہے اس کا بڑا حصّہ رائیگاں گیا۔ جن فنکاروں نے ادب کے ورثہ سے اپنا رشتہ بنائے رکھا اور جنہوں نے محض جدیدیت کے شوق میں ذہنی آوارہ گردی سے خود کو بچائے رکھا ان میں یقیناً شفیع اقبال اور اُن کے قبیل کے شعراء شامل ہیں۔

شفیع اقبال سلجھا ہوا ذہن رکھتے ہیں۔ میرؔ و غالبؔ کو اُنہوں نے پڑھا

ہے۔ امجد و اکبر الہ آبادی کی پاکیزہ روایت کا وہ احترام کرتے ہیں۔ شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد ویسے ہی محبت اور محنت کا شہر ہے۔ اس کی روایات کی گرفت مضبوط ہے وہ اپنے فنکاروں کو کسی بھی طرح کی آوارگی سے بچا لیتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ چند کے سوا حیدرآباد کے اکثر شعراء نے فن و فکر سے اپنے دامن کو وابستہ رکھا۔ اس میں بڑی محنت کی۔ ویسے بھی ریاضت کے بغیر فن میں جلا پیدا نہیں ہو سکتی

شعر کہنا بہت آسان سمجھتے ہو شفیع
عرق ریزی ہو تو پھر فن میں کمال آتا ہے

شفیع اقبال نے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھا اور عرق ریزی کے ذریعہ اپنے فن کو نقطۂ کمال کی طرف لے چلے! اور کچھ اس طرح کے دعوے بھی کئے۔ سہ

اپنے ہر شعر میں آمد ہے روانی ہے شفیع
ایک اک شعر کے مضمون میں جدّت دیکھی

مشہور آپ کی ہے مرصّع غزل شفیع
ہم کیا کہیں گے ایسے غزلخواں کے سامنے

یقیناً ان اشعار میں خود پرستی کا پہلو نمایاں ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ شفیع اقبال کے اشعار میں جہاں روانی اور جدّت ہے وہیں موضوعات کی رنگینی و فنکاری نے شفیع کی غزل کو مرصّع بنا دیا ہے۔

زندگی کا رشتہ ادب سے اٹوٹ ہے۔ ادب زندگی ہی کا تو آئینہ ہے۔ وہ اپنے اس آئینہ کو چراغ بھی بنا لیتا ہے تاکہ وہ زندگی کی جو حقیقتیں پنہاں ہیں اوروں کے سامنے نمایاں بھی کر سکے۔ اور جب یہ حقیقتیں نمایاں ہوتی ہیں تو قاری ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ قاری بھی خود اپنے طور پر ان ہی تجربات سے ہو کر گذرتا ہے۔ جن تجربات سے شاعر گذرا ہے۔ یا پھر شاعر کے اپنے اس کے تجربات ہونے کے باوجود وہ قاری کے تجربات بھی ہیں۔ یہی معاملہ مشاہدہ کا بھی ہے اور احساس اور جذبہ

کا بھی ! ___ ہم الگ الگ ہونے کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ہم ایک کُل کا حصہ ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم کُل ہونے کے باوجود اپنا ایک الگ وجود بھی رکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسا فلسفیانہ عمل ہے جس سے شاعر ہو کر گذرتا ہے اور اپنے قاری کی انگلی پکڑ کر اسے بھی اپنے ساتھ لے چلتا ہے۔

ہم نے مانگی ہے شفیع فرطِ جنوں میں اکثر
قلبِ سوزاں کی دعا، چاک گریباں کی دعا

راستے زندگی کے شفیع ؛ زُلف کے پیچ وخم ہو گئے

میں حدیثِ دل سُناتا ہی رہا ؛ اور کوئی مُسکرا کر رہ گیا

عشق کے واردات کی باتیں ؛ جیسے موت وحیات کی باتیں

ہمارا شہر بھی شہرِ عذاب جیسا ہے
بڑا کٹھن ہے یہاں جینا آدمی کے لئے

مرے گھر کی ہمیشہ خانہ جنگی ؛ کواڑوں سے پڑوسی دیکھتا ہے

یہ تجربے اور مشاہدے انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ وارداتِ قلب کا معاملہ ہو یا فی زمانہ وارداتِ شہر کا۔ ہمارے انفرادی تجربے اجتماعی نوعیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اس حقیقت کی روشنی میں شفیع اقبال کی شاعری خصوصی نوعیت بھی رکھتی ہے اور عمومی حیثیت بھی !۔

شفیع اقبال نے اپنی غزلوں اور نظموں میں عشقیہ مضامین باندھے ہیں۔ یہ اُردو شاعری کے مزاج کی بات ہے۔ اس طرح انہوں نے روایت پسندی سے انحراف نہیں کیا ہے۔ تاہم وہ راسخ العقیدہ انسان بھی ہیں، اس لئے زندگی کی اعلیٰ اقدار سے گریز نہیں کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جس طرح شفیع اقبال نے عشقیہ معاملات میں پیروئ میر میں کاملیت حاصل نہیں کی اُسی طرح وہ حالی یا اقبال کو اپنا "پیر رومی" بنانے میں بھی کامیاب نہیں رہے ہیں۔ تاہم ایک سچے اور پکے "مسلمان ہونے کا ثبوت اپنے قطعات کے ذریعہ دیا ہے۔

اللہ کا کلام ہے اللہ کی کتاب ٭ معبود کا پیام ہے اللہ کی کتاب
سینوں میں لفظ لفظ کو محفوظ کر دیا ٭ تا حشر فیضِ عام ہے اللہ کی کتاب

دستورِ کائنات بھی قرآنِ پاک ہے ٭ سرکارؐ کی حیات بھی قرآنِ پاک ہے
قرآن کا نزول ہے اک معجزہ شفیع ٭ اک ذریعۂ نجات بھی قرآنِ پاک ہے

مسرت کی بات تو یہ ہے کہ شفیع اقبال قرآنِ پاک کو دستورِ کائنات مانتے ہیں۔ یہ ان کا عقیدہ بھی ہے اور ایمان بھی۔ تب ہی تو ان سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ قرآنی تعلیمات کو اپنے لئے موضوعِ سخن بھی بنائیں گے اور ذریعہ نجات بھی! ایک پاکیزہ، پُر امن اور صالح معاشرہ کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ نہ صرف شفیع اقبال بلکہ عصرِ حاضر کے تمام شعراء قرآنی تعلیمات کو اپنا موضوعِ سخن بنائیں۔ آج کی یہ دنیا حالی، شبلی اور اقبال کے لئے ترس رہی ہے اور ہماری آنکھیں شفیع اقبال ایسے شعراء پر لگی ہیں۔

شفیع اقبال کے زیرِ نظر مجموعۂ کلام "خلشِ نارسا" میں بعض ایسے اشعار بھی شامل ہیں جن سے توقع بندھتی ہے کہ وہ اس طرح کے اشعار کہہ سکتے ہیں جن سے زندگی حرارت اور روشنی پاسکتی ہے۔ مثلاً

مضبوط نہ ہوں جس کے ارادے شفیع اقبال
وہ شخص رہِ زیست میں ناکام بہت ہے

رجعت پسند لوگو! اُس کو بھی ہے نعرا ❊ انسان کی حفاظت ایمان ہے ہمارا

اس نعرہ کو انقلاب کی نوید بنانا ہے۔ شفیع اقبال ایک صحافی بھی ہیں، اس لئے ان کی نظر انقلابات زمانہ پر ہے۔ آج انسان جس درندگی کا شکار ہے ماضی میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اور پھر یہ سب کچھ علم، ترقی اور تہذیب کے دعوؤں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ آج کا انسان مغالطوں کا شکار ہے۔ ان مغالطوں پر ضربِ کلیمی لگانی ضروری ہے۔

گو شفیع اقبال نے اپنی نظم "خلشِ نارسا" میں رومانی تجربے کو پیش کیا ہے مگر اس مجموعۂ کلام "خلشِ نارسا" کو موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کروں گا۔ انسانی اقدار کی پسپائی اور انسانی آرزوؤں اور تمناؤں کی ناکامی کی جو خلش ہے وہ زیادہ تڑپانے والی ہوتی ہے اور اس سے نجات ضروری ہے۔

۲۶ر جون ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر طیب انصاری
1/6/5-3-15، "المنیر" مہدی پٹنم۔
حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۲۸ء

کچھ اپنے بارے میں ۔۔۔۔۔

کلاسیکی شاعری اگرچہ گُل و بُلبل، برق و آشیاں اور عشقیہ مضامین سے معمور رہی ہے تاہم اس کا ہر شعر دلی جذبات و محسوسات کا درد سموئے ہوئے ہوتا ہے اور یہی درد قاری یا سامع کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے۔

اُردو شاعری نے پچھلی ایک صدی میں مختلف منازل طے کئے اور ایک دور وہ بھی آیا کہ جدید طرزِ فکر کی رَو میں خارجی کیفیات ہی کو موضوعِ سخن بنانے کی کوشش کی گئی اور مشاہدات و تجربات ہی کو ذہنی مشقت کی اساس پر نئے تراکیب اور لفظوں کی بازیگری کی مدد سے شاعری کی عمارت کھڑی کرنی چاہی لیکن یہ شاعری صرف شعری فارمولہ ہی بنی رہی کیونکہ اس میں بنیادی جزوِ شاعری، دلی جذبات اور عمیق محسوسات کی چاشنی کم کم تھی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اُردو شاعری نئے نئے منازل طے نہ کرے اور حالات اور انقلابات سے ارتباط نہ کرے بلکہ میں صرف یہی کہنا چاہوں گا کہ عمارت کتنی ہی خوبصورت بنائی جائے لیکن اس کی بنیاد اور ماہئیت پرہی عمارت قائم ہو۔ مطلب یہ کہ اُردو شاعری نئے اندازِ فکر اور جدّت پسندی کو اپنائے جو عصرِ جدید کا تقاضہ ہے لیکن محتاط اور مثبت انداز میں، تاکہ اُردو شاعری کا حقیقی چہرہ مسخ ہونے نہ پائے۔

میں نے اپنی شاعری میں یہی کوشش کی ہے کہ کلاسیکی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے عصرِ حاضر کے تقاضوں کو نئے رجحانات، نئی تراکیب و محاورات اور جدید اندازِ فکر مثبت اور متاثر کُن روّیہ کے ساتھ اپنایا جائے۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ میں اس عمل میں پوری طرح کامیاب ہوا ہوں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں نے صالح روایت اور جدید مثبت روّیہ سے مربوط راہ اختیار کی ہے اور اب اُردو کے اکثر و بیشتر شعراء

اس راہ کی اہمیت کو محسوس کرنے لگے ہیں۔

میں نے شاعرانہ ماحول میں ہی آنکھ کھولی۔ کمسنی میں والدِ محترم سید محمد وزیر آوارہ مرحوم کا حضرت جلیل، فانی بدایونی، امجد حیدرآبادی اور حیدرآباد کے نامور شعراء کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ میں بھی کبھی کبھار اُن کے ساتھ ہوتا۔ والد صاحب کے دیوان خانے میں اکثر شعراء احباب موجود ہوتے۔ شاعری سُنی سُنائی جاتی اور بحث و مباحثے بھی ہوا کرتے۔ اسی ماحول نے مجھے علم و ادب سے دلچسپی اور ذوقِ شاعری عطا کی۔ طالب علمی کے زمانے سے شعر کہتا رہا ہوں اور طالب علمی کے ہی زمانے سے حیدرآباد کے مشاعروں میں حصّہ لینا شروع کیا۔ اساتذۂ سخن کی موجودگی میں شعر پڑھنے کے مواقع فراہم ہونے سے حوصلے بلند ہوئے۔

اُسی زمانے میں، میں نے چار شعر کہے تھے ـــــ

عشق کے واردات کی باتیں ؛ جیسے موت و حیات کی باتیں
زاہد اک اور جام پینے دے ؛ پھر کریں گے نجات کی باتیں
ذکرِ سوزِ حیات باقی ہے ؛ کیا کریں کائنات کی باتیں
کھُل گئے جب کبھی لبِ گویا ؛ بن گئیں بات بات کی باتیں

اِسی زمین و بحر میں پاکستان کے ممتاز شاعر رئیس امروہی کی "شمع" میں چھپی ہوئی غزل کا پرچہ میرے ہاتھ لگا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میں نے انہیں کی زمین میں شعر کہے ہیں۔ والدِ محترم کو پہلے رئیس امروہی کی غزل پھر میرے اشعار پڑھ کر سُنائے۔ وہ بے حد خوش ہوئے اور کہا کہ تمھارے شعر رئیس امروہی کی غزل سے کسی طرح کم نہیں۔ مجھے روحانی خوشی حاصل ہوئی اور میرے حوصلے بلند ہوتے گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں محنت کروں تو اچھی شاعری کر سکتا ہوں۔ اس معاملے میں میرے برادرِ محترم صادق نوید نے بھی میرے حوصلے بڑھائے۔

میں نے جو کچھ اور جس انداز کی شاعری کی ہے وہ "خلشِ نارسا" کے کاغذی پیرہن میں آپ کے سامنے ہے ـــــ دیکھنا یہ ہے کہ یہ شاعری کس حد تک آپ کے شعری

ذوق کی تسکین کا باعث بنتی ہے۔

شعری مجموعوں کی اشاعت اب عام بات ہو کر رہ گئی ہے اور اکثر شعراء اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت کی کوششوں میں لگے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اُردو اکیڈیمیاں بھی اس سلسلے میں مالی اعانت کر رہی ہیں۔ میرے مجموعۂ کلام کی اشاعت میں تاخیر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں رواروی والے انداز میں کتاب کی اشاعت نہیں بلکہ اس میں کچھ انفرادیت اور دلکشی چاہتا تھا۔ کاغذ و طباعت کی گرانی اور دوسری دشواریوں کی وجہ سے میں اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب تو نہیں ہو سکا لیکن کوشش کی ہے کہ کچھ انفرادی کشش محسوس ہو۔

میں ڈاکٹر بشیر بدر کا ممنون ہوں کہ اُنہوں نے مختصر دورانِ قیام حیدرآباد اپنی مصروفیات کے باوجود میری شاعری پر اپنی رائے تحریر کر کے میری کتاب کی رونق بڑھائی۔ جناب مخمور سعیدی، جن سے عرصۂ دراز سے میرے برادرانہ مراسم ہیں۔ دلی اور حیدرآباد میں ملاقاتوں کے علاوہ اُن سے خط و کتابت کا رابطہ قائم ہے۔ جو خلوص و سادگی کے پیکر اور شیشے کی طرح شفاف صفت کے حامل ہیں۔ اُن کا بھی ممنون ہوں کہ اپنی گوں ناگوں مصروفیات کے باوجود "خلشِ نارسا" پر اظہارِ رائے سے اُسے اعتبار بخشا۔ حضرت علی احمد جلیلی جو حیدرآباد کے عصرِ حاضر کے اساتذۂ سخن میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، اُنہوں نے بڑی فراخدلی اور عنایت کے ساتھ میری شاعرانہ فنکاری پر رائے لکھ کر میری کاوشوں کو جلا بخشی۔ میں تہہِ دل سے اُن کا ممنون و مشکور ہوں۔ ڈاکٹر طیب انصاری جو جنوبی ہند کے نامور ادیب و نقاد ہیں، جنھوں نے اپنا قیمتی وقت دے کر میری شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا، میں اُن کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جس نے میری زیرِ نظر کتاب "خلشِ نارسا" کی اشاعت میں جزوی مالی اعانت کر کے میرے اس کام کو آسان بنا دیا۔

شفیع اقبال بی۔ اے (عثمانیہ)

مدیر "ہماری منزل" ہفتہ وار، حیدرآباد۔

نعتِ شریف

بحرِ کرم ہیں چشمۂ جود و سخا ہیں آپؐ
اُمید اور یقین سے بھی ماورا ہیں آپؐ

محبوب ذوالجلال، شہِ انبیاء ہیں آپؐ
خیرالبشر، حبیبِ خدا، مصطفٰے ہیں آپؐ

دنیا کو جس نے راہِ صداقت دکھائی ہے
ہادی وہی ہیں آپ، وہی رہنما ہیں آپؐ

ہیں آپ ہی تو باعثِ تخلیق کائنات
ہیں ابتدا بھی آپؐ ہی، اور انتہا ہیں آپؐ

سایہ زمین پر نہ پڑا آپؐ کا کبھی
ثابت اِسی سے ہو گیا نورِ خدا ہیں آپؐ

اُمت کو اپنی خلد میں لے جائیں گے ضرور
محشر میں ہر بشر کے لئے پیشوا ہیں آپؐ

ادنیٰ غلام آپؐ کا ہے اُمتی شفیع
بخشش کرائیں اُس کی شفیع الوریٰ ہیں آپؐ

نعتِ شریف



آپؐ ہیں احمدِ مختار مدینے والے
ہم ہیں رحمت کے طلبگار مدینے والے

میری دنیا تو جہنم ہی بنی میرے لئے
میری عقبیٰ بنے گلزار مدینے والے

جرأتِ دید کا اظہار تو کرلوں لیکن
میری قسمت میں ہو دیدار مدینے والے

نام سے آپؐ کے نسبت تو بڑھی ہے میری
ہوں غلام آپؐ کا سرکارؐ مدینے والے

آپؐ کی زلفِ معنبر کی مہک کے صدقے
تا ابد ہم رہیں سرشار مدینے والے

آپؐ ہیں شافعِ محشر تو نہیں فکر شفیع
آپؐ ہیں سب کے مددگار مدینے والے

ماہِ رمضان المبارک

بندگی ہی بندگی ایمان ہی ایمان ہے
بخششوں کے واسطے آیا ہوا رمضان ہے

اب گناہوں کا کرو مت تذکرہ اے مومنو
ہاں یقیناً قید میں جکڑا ہوا شیطان ہے

یہ وہی ماہِ مبارک، یہ وہی عظمت کے دن
آسماں سے اِن دنوں نازل ہوا قرآن ہے

ہے زیادہ سے زیادہ ایک نیکی کا ثواب
ماہِ رمضاں میں خدائے پاک کا فرمان ہے

جا بہ جا لمحہ بہ لمحہ دیکھئے اُس کا ظہور
ایک سجدے میں چھپا، عرفان ہی عرفان ہے

دن ہیں نورانی تو راتیں فیض سے معمور ہیں
"ماہِ رمضان المبارک کی نرالی شان ہے"

ہم نے بھی پائی ہے برکت اِس مہینے کی شفیع
دامن اپنا بھر گیا اللہ کا اِحسان ہے

قطعات

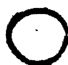
قرآنِ پاک



دستورِ کائنات بھی قرآنِ پاک ہے
سرکارؐ کی حیات بھی قرآنِ پاک ہے
قرآن کا نزول ہے اک معجزہ شفیع
اک ذریعۂ نجات بھی قرآنِ پاک ہے



اللہ کا کلام ہے اللہ کی کتاب
معبود کا پیام ہے اللہ کی کتاب
سینوں میں لفظ لفظ کو محفوظ کر دیا
تا حشر فیضِ عام ہے اللہ کی کتاب



قطعات

○

مظلوم کی غمخوار کی فریاد حسینؑ ٭ ہے وقتِ مدد کیجئے امداد حسینؑ
جنت کے ہیں سردار شہیدوں کے امام ٭ سچ پوچھو تو ہیں دین کی بنیاد حسینؑ

○

اللہ کا فرمان ہیں ایماں والے ٭ اسلام کا عرفان ہیں ایماں والے
کٹ جاتے ہیں لیکن نہیں جھکتے ہرگز ٭ کیا بندۂ ذیشان ہیں ایماں والے

○

میدانِ امتحان ہے ایثار کی جگہ ٭ میدانِ کربلا کوئی میدانِ جنگ نہیں
عظمت صدائے حق کی شہیدوں کی ہے مگر ٭ حق کی نظر میں عظمتِ تیرِ تفنگ نہیں

○

اسلام کا پرچم ہیں صدائے حق ہیں ٭ ایثار کا پیکر ہیں فدائے حق ہیں
اُمت کے مسیحا ہیں طرحدار حسینؑ ٭ عرفانِ پیمبرؐ ہیں ندائے حق ہیں



مَنقبت

ہر شخص چاہتا ہے اُسے سیم و زر مِلے
لِلّٰہ مجھ کو تیرے کرم کی نظر مِلے

مجھ کو نوازنا ہے تو اتنا نواز دے
تیری نوازشوں کے مجھے بحر و بَر مِلے

منزل پہ خود بہ خود میں پہنچ جاؤں گا ضرور
پہلے تِری گلی تو مِلے، رہگذر مِلے

اُڑ کر چلا میں جاؤں دیارِ حبیبؐ میں
پروردگار مجھ کو اگر بال و پر مِلے

دربارِ یوسفینؒ سے اِتنا تو فیض ہو
منزل پہ آپؒ ہیں مجھے گردِ سفر مِلے

کب سے میں، مبتلائے غمِ روزگار ہوں
کوئی تو غمگُسار مِلے، چارہ گر مِلے

نسبت اِس آستاں سے ہمیشہ رہے شفیعؔ
صدقہ تمھارے دَر کا مجھے عمر بھر مِلے

ادبی قطعات

اِحساسِ مجروح

سیاہ شب کسی زلفِ دراز کی مانند
مچل رہی ہے اُفق کے گداز شانوں پر
کسی کی یاد کے دیپک سے جھلملاتے ہیں
مِرے خیال کے تاریک آسمانوں پر

جنبشِ لمحات

رات بھر جاگتی سوتی ہوئی مخمور آنکھیں
پلکیں جھپکانے لگیں نیند سے بوجھل بوجھل
ایک اک کرکے سبھی ڈوب گئے ماہ و نجوم
ڈھل گیا خود ہی سیاہ رات کے سر سے آنچل

تصویرِ مجسّم

چاند دیکھوں تو ترے رُخ کے منوّر سے نقوش
یک بیک چاند کے چہرے پہ اُبھر آتے ہیں
تیرے آنچل پہ دمکتے ہوئے موتی جیسے
یہ ستارے مہِ تاباں سے ضیاء پاتے ہیں



صبحِ نگاراں

سحر، جو دستِ حنائی میں آفتاب لئے
اُٹھی تو ظلمتِ شب کے رباب ٹوٹ گئے
نسیمِ صبح کے ہلکے سے ایک جھونکے سے
مرے حسین خیالوں کے خواب ٹوٹ گئے



اپنی تقدیر کو راس آیا ہے غم
دل ہوا وقفِ رنج و الم دوستو
ہمسفر چھُٹ گئے، راستے مِٹ گئے
تھک گئے چلتے چلتے قدم دوستو



ایک مدّت ہوئی مسکرا کر ہمیں
ہونٹ جیسے ہنسی جانتے ہی نہیں
یا تو بیمارِ آلامِ جاں ہو گئے
یا تو فکروں سے ہم چھوٹتے ہی نہیں



سیاسی قطعات



ذہنِ فرسودہ کے بیمار نہیں بچ سکتے
ایسے معصوم گنہ گار نہیں بچ سکتے
مصلحت کیش نقیبوں سے یہ کہہ دو لوگو!
ملک اور قوم کے غدّار نہیں بچ سکتے



عزم کی آہنی دیوار ہے اندرا گاندھی
ملک اور قوم کی معمار ہے اندرا گاندھی
مہر و اخلاص کا پیکر ہے دیا کی دیوی
عدل و انصاف کی تلوار ہے اندرا گاندھی



ایسے کچھ لوگ ہیں شعلوں کو ہوا دیتے ہیں
کتنے سوئے ہوئے فتنوں کو جگا دیتے ہیں
چند تخریب کے تنکوں کا سہارا لے کر
رخرمنِ امن میں اک آگ لگا دیتے ہیں



نظمیں

ایک نظم

ایک ننھا سا لڑکا
اِدھر سے اُدھر مارا مارا پھرا
"دن میں اور رات میں
نور و ظلمات میں"
خوب پڑھتا رہا
خوب لکھتا رہا
دن گزرتے گئے
اور ـــــ پھر یوں ہوا
ایک گلفام سے اُس کو اُلفت ہوئی
اس کی پوجا میں وہ
دل لُٹانے لگا
خوب پینگیں بڑھیں
خوب چرچا ہوا
ایک دن وہ حسیں
جانے کس موڑ پہ

خود ہی گم ہو گئی

اب وہ پھرتا ہے اس شہر میں در بہ در
لوگ کہتے ہیں اب
ایک پاگل ہے وہ ......!! ●●

خلشِ نارسا

اچانک ہوا کیا کہ تم مجھ سے روٹھیں
کہ تم نے تو ملنا ملانا بھی چھوڑا
اگر راستے میں ملیں اتفاقاً
تو کترا کے اِک اجنبی کی طرح تم
مری راہ سے ہو کے انجان گزریں
مجھے تم نے چاہا تھا
لیکن تمہیں نے
خدا جانے کیوں مجھ کو ٹھکرا دیا تھا

بہت کچھ ہوا تین برسوں میں اب تک
مجھے مل گیا ہمسفر زندگی کا
مجھے اُس نے میری نشانی بھی دے دی
کہ ملتی ہے جس سے مجھے شادمانی

مگر تم اکیلی ہو تنہا ہو اب تک
میں یہ سوچتا ہوں
کہ اب بھی تمہارا میں ہمدرد کیوں ہوں!!

کشمکش



اِحساس کے دریچے سے
جھانکتی ہے تنہائی
دل کے ویراں جنگل میں
پتّیاں کھڑکتی ہیں
جیسے کوئی آتا ہے

گھُپ اندھیرے کمرے میں
کچھ نظر نہیں آتا
ہم کہاں سے نکلے تھے
ہم کدھر کو جائیں گے ــــــ؟؟

سفر



سیاہ چٹانیں
ہیں سوکھے پودے
زمین بنجر
فضاء میں جیسے دھواں دھواں ہے
جو پیچھے گزری
گزر گئی وہ

کہاں ہے جانا پتہ نہیں ہے
حیات اپنی بھی اِک سفر ہے
پتہ نہیں ہے کہاں ہے منزل ــــ!! ▲▲

دُختران شب

رات کی سیاہ فام بیٹیاں
آفتاب پی کے رشکِ ماہتاب ہوگئیں
دشتِ شب میں خود ہی حُسنِ انتخاب ہوگئیں

اور پھر
جسم پرستارے جھلملا اُٹھے
یعنی زخم کھِل اُٹھے
لہو دہانِ زخم سے اُبل پڑا
اُفق کے اک گڑھے میں جاکے جم گیا
اور اُس گڑھے سے پھر
آفتابِ نو کا ایک دیوتا
جاگ اُٹھا
اور پھر سحر ہوئی
تو رات کی سیاہ فام بیٹیاں
بے نقاب ہوگئیں
لاجواب ہوگئیں ــــ !!

ٹیلہ

(سانیٹ)



چھوٹا سا اِک ٹیلہ جس پہ
بکھرے پتھر تھے ہر سُو
کوئی پودا پھول نہ خوشبو
دھوپ کڑی رہتی تھی اکثر

اِک دن تم نے مجھ سے کہا تھا
آؤ چلیں گے اُس ٹیلے پر
ہم نے اُس ٹیلے پر جا کر
باہم کچھ اِقرار کیا تھا

پیار کا اِک ننھا سا پودا
تم نے اُس ٹیلہ پہ لگا کر
ارمانوں کے پھول کھلا کر
جانے مَن سے کیوں بِسرایا
پیار کا پودا سوکھ چکا ہے
اور وہ ٹیلہ چمن بنا ہے

مخدوم تھا ہمارا

(سانیٹ)



اخلاص کا نمونہ، انسانیت کا پیکر
تہذیبِ نو کا نیّر، مخدوم تھا ہمارا
ہر آدمی سے بہتر مخدوم تھا ہمارا
ہر راہرو کا ساتھی، ہر قافلے کا رہبر

جنگ و جدل کا دشمن، امن و اماں کا حامی
مفلس کے دل کی دھڑکن، مزدور کا سہارا
مخدوم تھا ہمارا، مخدوم تھا ہمارا
تھی ناپسند جس کو انسان کی غلامی

شاعر تھا منفرد وہ، علم و ہنر میں یکتا
ہر لفظ ایک شعلہ، ہر بات انقلابی
غزلیں تھیں ماہتابی، نظمیں تھیں آفتابی
تھی جن کی روشنی سے پُرنور ایک دنیا

انمول ایک موتی ساگر میں کھو گیا ہے
آغوش میں فنا کی مخدوم سو گیا ہے

اِحساس کے زخم



خیالوں کے دھاگے اُلجھنے لگے
یادِ بستر کی میرے شِکن بن گئی
نیند تاریک وادی میں گُم ہو گئی
شب خلاؤں کا لمبا سفر بن گئی

ہجر کے
کرب کے
احساس کے زخم
بجھ بجھ کے ہر بار جلنے لگے

شاہراہیں اُجالوں میں بہتی رہیں
سینکڑوں آدمی
سیکلیں، موٹریں
شاہراہوں کے سیلاب میں بہہ گئے
میرا احساس بھی
بہہ گیا

خار و خس کی طرح

شاہراہیں اندھیروں میں گم ہوگئیں
اور ذہنِ رسا پر کہر چھا گیا

اور
خیالوں کے دھاگے اُلجھنے لگے
یاد بستر کے میرے شکن بن گئی
نیند تاریک وادی میں گم ہوگئی
شب خلاؤں سا لمبا سفر بن گئی

ہجر کے
کرب کے

احساس کے زخم
بجھ بجھ کے ہر بار جلنے لگے ــ!!

احساس کے زخم

خیالوں کے دھاگے اُلجھنے لگے
یاد بستر کی میرے شکن بن گئی
نیند تاریک وادی میں گم ہو گئی
شب خلاؤں کا لمبا سفر بن گئی
ہجر کے
کرب کے
احساس کے زخم
بجھ بجھ کے ہر بار جلنے لگے

شاہراہیں اُجالوں میں بہتی رہیں
سینکڑوں آدمی
سیکلیں، موٹریں
شاہراہوں کے سیلاب میں بہہ گئے
میرا احساس بھی
بہہ گیا

خار و خس کی طرح

شاہراہیں اندھیروں میں گُم ہوگئیں
اور ذہنِ رسا پہ کہر چھا گیا

اور
خیالوں کے دھاگے اُلجھنے لگے
یادِ بستر کے میرے شکن بن گئی
نیند تاریک وادی میں گُم ہوگئی
شب خلاؤں سا لمبا سفر بن گئی

ہجر کے
کرب کے

احساس کے زخم
بجھ بجھ کے ہر بار جلنے لگے۔۔۔!!

نقطۂ انجماد



نقطۂ انجماد
پھیلاؤ
کرب کے زیروبم
زلزلے
اُبلتے ہوئے کوہِ آتش فشاں
کڑی دھوپ
تپتی ہوئی سرزمیں
اُلجھنیں، گتھیاں
ذہن مفلوج
ڈھانچے ہیں رقصاں مگر
خواب میٹھے، سنہرے بہت دلفریب
جس کی تعبیر جیسے "ہُما" کا وجود
زندگی بس یہی ہے
یہی ہے یہی ـــــ !! ••

شعلۂ تر



بھیگ رہی ہو
بھیگو مت
بارش میں تم
بھیگو گی تو
کپڑے تن سے چمٹ جائیں گے
تم تو ہوا انجان سی لیکن
اوروں پر کیا بیتے گی
دل میں طوفاں جاگ اُٹھے گا
آگ سی تن میں لگ جائے گی
اور تمھارے حُسن کا شعلہ
سوئے ہوئے جذبات کو میرے
تڑپا دے گا
بھڑکا دے گا ....!
بھیگ رہی ہو
بھیگو مت
بارش میں تم ——— ▲▲

نقش برآب



وہ نقش !
بساطِ دلِ احساس پہ اُبھرا
وہ نقش حقیقت میں ڈھلا
روح بنا
جسم کے قالب میں کبھی دھڑکا
وہ نقش جو پیوستِ رگِ جاں کبھی ٹھہرا
وہ نقش جو آنکھوں کی ضیاء بن کے کبھی نکھرا
وہ نقش جو تصویر بنا
ذہن پہ چھایا
وہ نقش محبّت کے حسیں رنگوں میں چمکا
وہ نقش جو گہرائیِ دل میں کبھی اُترا ــــ!

وہ نقش اچانک جو بکھر جائے تو کیا ہو
نشتر کی طرح دل میں اُتر جائے تو کیا ہو!
کیا ہو جو [illegible] تصوّر سے کبھی چھن جائے!
یہ سانحہ [illegible] کہیں پاگل نہ بنا دے ــــ !! ••

خواب کی دہلیز پر



نرم و نازک سا بدن
پھول سا چہرہ اُس کا
آنکھ نرگس ہے تو
اُس شوخ کے عارض ہیں گلاب
لب!
اُفق پر کوئی پھیلی ہوئی سُرخی کی لکیر
زُلف بکھری ہوئی
گھنگور گھٹائیں جیسے
چال!
اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی چنچل سی پون
نقرئی گھنٹیاں بجتی ہیں
اگر بات کرے
قہقہہ اُس کا
اچانک کوئی ساغر کھنکے

دل میں طوفان اُٹھے
موجِ تبسّم جو چلے
آنکھ مِل جائے تو تجلی کی چمک پیدا ہو
دِل سے مِل جائے اگر دل
تو زمانہ مِل جائے ـــــ!!



یہ کیسی برسات



بادل آئے
دھوم مچائے
بِن برسے اُڑ جائے
دھوپ کی چادر چمن چمن کی کلیوں کو کمُلائے
پتّہ پتّہ سوکھ کے ڈالی سے جھڑ جائے
پھول جھڑے اور بکھر بکھر کر مٹّی میں مِل جائے
یہ کیسی برسات ہے یارو!
یہ کیسی برسات !!
ندّی نالا ہاتھ پسارے اِک اِک قطرہ مانگے
دھرتی اپنی چھاتی پیٹے ٹکڑوں میں بٹ جائے
کنکر کنکر سُوکھ سُوکھ کر دھول بنے اُڑ جائے
یہ کیسی برسات ہے یارو !
یہ کیسی برسات !!
سورج کی کرنیں بھون بھون کر انسانوں کو کھائے

چوسں کے اُس کے انگ کا پانی
اپنی پیاس بجھائے
یہ کیسی برسات ہے یارو !
یہ کیسی برسات !!
آٹا مہنگا، چاول مہنگا
مہنگا ہے سنسار
سستا خون ملے گا تم کو
سستا عصمت کا بازار
اب کے بھی ورشا نہ ہوئی تو
مہنگائی بڑھ جائے
سستی ہو عورت کی عصمت
اور کھلیں بازار ..... !!



خواہشِ بے زباں



یہ حقیقت ہے کہ تم میری ہو ہمرازِ حیات
میں اِک فنکار ہوں
اِحساس کا مارا میں ہوں
حُسن و فطرت کا پرستار
وفادار ہوں میں
میں محبّت کے سمندر میں بکھرنا چاہوں
ٹوٹ کر چاہے کوئی

ہے یہ تمنّا میری
میں، مہکتی ہوئی سانسوں کی ہوا بن جاؤں
اور تم
میری شہ رگ کا لہو بن جاؤ
میرے سینے میں دھڑکتا ہوا دل بن جاؤ

تم نہ ہوتی ہو تو

اِک یاد بگولہ بن کر
میرے اس جسم کے صحرا کے ہر اک گوشے میں
کرب کی دھول لئے پھرتی ہے مارے مارے
لمحہ لمحہ میرا احساس جھُلستا ہے
مگر ـــــ!
تم جو آجاتی ہو
معمول پہ آتی ہے حیات
پھر وہی جھگڑے
شب و روز کی ذمّہ داری ـــــ!!

یہ تمنّا کہ مجھے ٹوٹ کے چاہے کوئی
یہ تصوّر کہ میں تمثیلِ وفا بن جاؤں
یہ حقیقت ہے کہ تم میری ہو ہمرازِ حیات
میری ضرورت ہو کر مگر
یہ تو مشکل ہے کہ
تم ٹوٹ کے چاہو گی مجھے
اور میں تمثیلِ وفا بن جاؤ ـــــ!!

●●

سورج پگھل گیا



(اندرا گاندھی کے قتل پر)

کیسے یقین آئے کہ سورج پگھل گیا
کس طرح مان لیں کہ اُجالوں کے دیش میں
تاریکیوں نے آس کا دیپک بجھا دیا
کس نے کیا ہے قتل سمندر کی لہر کو
کس نے کیا ہے چھلنی فولاد کا بدن
کس نے نگاہِ برق کو بے نور کر دیا ـــ!
کیسے یقین آئے کہ سورج پگھل گیا ـــ!!

اندرا تمہارے نقشِ قدم کہکشاں میں تھے
اندرا تمہارے ہاتھ کمندِ خلاء بھی تھے
اندرا تمہاری فکر تھی شاہیں بنی ہوئی
اندرا تمہاری دور اُفق پر نگاہ تھی
اندرا تمہارا عزم ہمالہ کی چوٹیاں
اندرا تمہارے حوصلے ساگر تھے بیکراں

تم ہی تو ملک و قوم کی معمار و پاسباں
تم ہی تو راہبر تھیں، تم ہی تو رہنما
تم کو کیا ہے قتل کسی بدنصیب نے
سورج پہ اپنے دل کی سیاہی اُچھال کر
کیسے یقین آئے کہ سورج پگھل گیا ــــــ !!

اضطراب



سکونِ دل کہاں ڈھونڈیں
قرارِ جاں کہاں پائیں
ہماری زندگی شعلہ بداماں ہو گئی یارو
نہ ارماں دل میں اُٹھتے ہیں
نہ چاہت دل میں ہے باقی
نہ کھانے کی کوئی خواہش

نہ پینے کا مزہ یارو
فقط ایک کارخانہ ہے
مشینیں چلتی رہتی ہیں
یہ کیسا شور ہے یارب
یہ کیسا غل مچا گھر میں
قلم
کاغذ
کتابیں
روشنائی

عمیرہ کا خانہ
سبھی چیزیں
ہمارے گھر میں بچوں کا کھلونا ہیں
کہاں پڑھتے
کہاں لکھتے
کہاں کی شاعری یارو
اگر دو ایک ہوتے ایسا ہنگامہ کہاں ہوتا !
خوشی ہوتی
سکوں ہوتا
یہ گھر جنّت نشاں ہوتا ــــ !!

پیغامِ امن



رجعت پسند لوگو اُسن لو یہی ہے نعرا
اِنسان کی حفاظت ایمان ہے ہمارا

آپس میں مِل کے رہنا ہم خوب جانتے ہیں
ہندو کو بھائی اپنا مسلم جو مانتے ہیں
مسلم سے پیار کرنا ہندو بھی جانتے ہیں

آپس میں بیر رکھنا ہم کو نہیں گوارا
اِنسان کی حفاظت ایمان ہے ہمارا

گنگا ندی میں [illegible] آتی ہیں مسلم
نانک کی سمر [illegible] یں دونوں باہم
لہروں پہ رام سیتا کے نقش بھی ہیں قائم

لکشمن ہے ایک دھارا چشتی ہے ایک دھارا
انسان کی حفاظت ایمان ہے ہمارا

اُتّر میں ایک بھاشا، دکشن میں ایک بھاشا
پورب میں ایک جاتی، پچھّم میں ایک فرقا
کیوں ہو ایک جہتی، ہم سب کی ایک اِچھّا
ہر پھول نے کلی نے گلشن کو ہے سنوارا
اِنسان کی حفاظت ایمان ہے ہمارا

ہم امن کے پُجاری، ہم امن کے سپاہی
اِنسانیت کی راہوں پہ چلنے والے راہی
ہونے نہ دیں گے ہرگز تہذیب کی تباہی
ہم پاسباں وطن کے، ہم کو وطن ہے پیارا
اِنسان کی حفاظت ایمان ہے ہمارا

آؤ یہ عہد کر لیں ہرگز نہ ہم لڑیں گے
اَشرار کے ارادے پورے نہ ہونے دینگے
اَمن و اَماں کی خاطر اپنا لہو بھی دیں گے
دیکھے گی ساری دنیا ایسا بھی اِک نظارہ
اِنسان کی حفاظت ایمان ہے ہمارا



شہرِ نگاراں، حیدرآباد



گذشتہ چار صدیوں سے
یہاں انسان بستے ہیں
قطب شاہ نے ہمارے شہر کی بنیاد رکھی تھی
ہزاروں رنگ دیکھے ہیں
اِسی شہرِ نگاراں نے
بہاریں سینکڑوں آئیں
خزاں نے بارہا لوٹا
مگر اب بھی شباب اِس کا
اَچھوتا ہے، کنوارا ہے

رواداری و یکجہتی
محبّت اور ملنساری
ہمارے شہر کی فطرت میں داخل ہے وفاداری
یہی تہذیب ہے اس کی

یہی قومی اثاثہ ہے

چار مینارہ اس شہر کی اِک علامت ہے
ہندو، مسلم، سکھ و عیسائی
ہیں جیسے چار مینارے
عمارت ایک ہے لیکن
بہت اونچی
بڑی ذیشان ــــ!!

یہیں تو جامعۂ عثمانیہ ہے مادرِ علم و ادب
سینکڑوں پیدا کئے
جس نے
مدبّر رہنما
دانشور و اہلِ ہُنر

شعر و ادب کا اِک دبستاں
اور غزل کی آبرو
یہ قطب شاہ و دکنی

امجدؔ، صفیؔ
مخدومؔ، شاہدؔ
اور اریبؔ و شاذؔ کا مسکن
فضاء میں شعر کی مستی
ہوا میں نغمہ و سرگم

دھوپ کی کرنوں میں جیسے وادئ زرّیں ہے یہ
رات کی تاریکیوں میں
جگمگاتے قمقموں سے
ان ستاروں سے پرے
آباد اک دنیا لگے

جو بھی آیا اس شہر میں بن گیا اُس کا وطن
یعنی جنّت ہے ہمارے ملک کی ارضِ دکن ـــ!!

غزلیں



موسمِ گُل اب آئے نہ آئے
ہم تو بیٹھے ہیں جام چھلکائے

دل کا کیا حال ہو خدا جانے
آ رہے ہیں وہ زُلف بکھرائے

پی چکے ہم بہت بس اب ساقی
آنکھوں آنکھوں میں دور چل جائے

جانتے ہیں زباں ہم آنکھوں کی
کیا ہی اچھا ہو بات بن جائے

دل کی ویران خواب گاہوں میں
تیری یادوں کے قافلے آئے

زخمِ دل ہے چراغِ راہ گزر
کون اب تیرگی سے گھبرائے



تو نے ہمیں دیا بھی اگر دل تو کیا دیا
ہم نے تو تیری راہ میں سب کچھ لُٹا دیا

مجھ کو حیات دی بھی تو کیسی حیات دی
دل بھی دیا جو تُو نے تو غم آشنا دیا

اے ضبط اُن کے آگے زباں چپ رہی تو کیا
آنکھوں نے اپنے دل کا فسانہ سُنا دیا

اپنا ہی مجھ کو ہوش نہ دنیا کا ہوش ہے
اے بے خودی یہ تو نے مجھے کیا بنا دیا

بس اتنا ہوش ہے کہ تمہیں بھولتے نہیں
"ہم نے تمہاری یاد میں سب کچھ بھُلا دیا"

راہِ وفا میں لُٹ گئے کچھ اس طرح شفیع
جیسے کسی نے نقشِ کفِ پا مٹا دیا



درد ہوگا نہ کوئی درد کا درماں ہوگا
وہ جو حالت پہ مرے دل کی مہرباں ہوگا

"فصلِ گُل آئی ہے سرسبز گلستاں ہوگا"
میکشو! آؤ کہ پھر عیش کا ساماں ہوگا

اُلجھنیں اور بڑھیں گی جو تری یاد آئے
تیرے دیدار سے دل اور پریشاں ہوگا

مُلتفت گر نہ سہی، تیرا تغافل ہی سہی
میرے اخلاص سے تو خود ہی پشیماں ہوگا



عشق کے واردات کی باتیں
جیسے موت و حیات کی باتیں

زاہد اِک اور جام پینے دے
پھر کریں گے نجات کی باتیں

ذکرِ سوزِ حیات باقی ہے
کیا کریں کائنات کی باتیں

کھُل گئے جب کبھی لبِ گویا
بن گئیں بات بات کی باتیں



ٹوٹا ہوا فلک کا ستارا نہ ہو کہیں
یہ دل غمِ حیات کا مارا نہ ہو کہیں!

پھر یک بہ یک اُفق پہ سیاہی سی چھا گئی
کاجل کسی کی آنکھ کا پھیلا نہ ہو کہیں

غم اور بھی ہیں دل کو غمِ عشق کے سوا
غم آپ کا ہی دل کو گوارا نہ ہو کہیں

لہروں پہ عزم کے ہے رواں کشتیٔ حیات
حائل سفر میں کوئی کنارا نہ ہو کہیں

جس کو سمجھ رہے ہیں شفیعؔ ذرّہ حقیر
وہ بھی اُبھرتا اوج کا تارا نہ ہو کہیں



کوئی آنکھوں میں سما کر رہ گیا
دل بھی آخر چوٹ کھا کر رہ گیا

دل ہمیشہ ہی رہا معمورِ غم
اِک گیا اور ایک آ کر رہ گیا

تیرے روشن رُخ کا جلوہ دیکھ کر
چاند پیچ و تاب کھا کر رہ گیا

اب یہی غم ہے کہ کوئی غم نہیں
مجھ کو ہر غم آزما کر رہ گیا

میں حدیثِ دل سُناتا ہی رہا
اور کوئی مُسکرا کر رہ گیا

دشتِ تنہائی میں اک تیرا خیال
دل میں کانٹا سا چُبھا کر رہ گیا

دل کو ویرانہ سمجھتے تھے شفیع
کوئی اِس گھر میں بھی آ کر رہ گیا



دل کہ جیسے کوئی شکستہ ساز
سانس اٹھتی ہوئی سی اِک آواز

تیری زُلفوں کے پیچ و خم جیسے
میری راہوں کے ہیں نشیب و فراز

زیست! وقفِ غمِ جہاں ہے دوست
وہیں ہوں اپنی شکست کی آواز

پہلے آنکھوں سے دور چل جائے
پھر ہوئے کا سانحہ آغاز

شیشۂ دل کو توڑنے والے
کیا اسے جوڑ دے گا شیشہ ساز



آسماں پر اب کوئی بادل نہیں
یا طبیعت میں کوئی ہلچل نہیں

ڈھل گیا ہے اس طرح اب آسماں
جیسے تیری آنکھ میں کاجل نہیں

مضطرب ہیں ہم کسی کی یاد میں
اور وہ ہیں کہ ذرا بیکل نہیں

قتل ہوتے ہیں یہاں بھی بے حساب
گو ترا کوچہ ہے یہ مقتل نہیں

اس طرح وہ میرے دل پر چھا گئے
جیسے میری آنکھ سے اوجھل نہیں

زخم کھائے ہیں مرے دل نے بہت
صرف چشمِ ناز کا گھائل نہیں

زندگی ہو حاصلِ عیش و طرب
میں، شفیعؔ اس بات کا قائل نہیں



کون جانے کہ زندگی کیا ہے
رنج کیا چیز ہے خوشی کیا ہے

راز ہی راز آدمی کا وجود
اک پہیلی ہے آدمی کیا ہے

کم سے کم اک نگاہِ دزدیدہ
ہم سے ایسی بھی بے رُخی کیا ہے

دعوئے دوستی تو کر بیٹھے
یہ بھی جانا کہ دوستی کیا ہے؟

تیری صورت جواب ماہِ تمام
تیرا جلوہ ہے چاندنی کیا ہے

زندگی غم کا، غم خوشی کا نام
کیا بتائیں کہ زندگی کیا ہے

زندگی نام ہے اگر غم کا
پھر یہ ہنگامۂ خوشی کیا ہے

عام دیدارِ حُسن عشق ارزاں
اِک تماشہ ہے عاشقی کیا ہے

ہے تیقیع چشم مست کا صدقہ
ورنہ ساغر میں دلکشی کیا ہے





ہو گئے برباد زندگانی سے
کون اُلجھے تری جوانی سے

داستانِ دلِ حزیں اپنی
مِل نہ جائے تری کہانی سے

بن گئے ہوں جو کشتگانِ اَلم
کیا غرض اُن کو شادمانی سے

اپنی آنکھوں سے مئے پلا ساقی
پیاس کیسے بجھے گی پانی سے

بوجھ سر پہ ہے یوں کہ سر اُٹھے
سنگِ وحشت تری گرانی سے

پھر نہ چھیڑو شفیعؔ فسانۂ دل
فائدہ کیا ہے لن ترانی سے



ہر غم سے آشنا ہیں ہمارے وطن کے لوگ
یادِ وقت کی صدا ہیں ہمارے وطن کے لوگ

مرتے ہیں دوستی کے محبّت کے نام پر
سرچشمۂ وفا ہیں ہمارے وطن کے لوگ

امن و اماں کی خیر، تلاطم کا خوف کیا
کشتی کے ناخدا ہیں ہمارے وطن کے لوگ

دنیا میں اپنا کوئی سہارا نہیں تو کیا!
خود اپنا آسرا ہیں ہمارے وطن کے لوگ

کہنے کو اور بھی ہیں خردمند و باوقار
سب سے مگر جُدا ہیں ہمارے وطن کے لوگ

ویسے تو پُر خلوص ہیں، ذی فہم ہیں مگر
ناداں بھی ذرا ہیں ہمارے وطن کے لوگ



وہ جو اہلِ ستم بن گئے ۔۔ ہم بھی تصویرِ غم بن گئے
جس کی اُلفت کا دعویٰ کیا ۔۔ اُسکے نقشِ قدم بن گئے
دِل کا مذہب ہی کچھ اور تھا ۔۔ کیوں یہ دَیر و حَرم بن گئے
جو کرم ہم پہ کرتے رہے ۔۔ آج تیغِ ستم بن گئے
تیرے نقشِ قدم کیا ہوئے ۔۔ کُشتگانِ اَلم بن گئے
اُن کو پوُجیں کہ سر پھوڑ لیں ۔۔ پتّھروں کے صَنم بن گئے
ایک غم اُس نے مجھ کو دیا ۔۔ اور کتنے ہی غم بن گئے
دل کی روداد سُنتے ہی وہ ۔۔ پیکرِ چشمِ نَم بن گئے

راستے زندگی کے شفیعؔ
زُلف کے پیچ و خم بن گئے





ہمارے عزم کی منزل کو آسماں کہیئے
ہمارے نقشِ کفِ پا کو کہکشاں کہیئے

نظر کو برق جو کہیئے تو گیسوؤں کو گھٹا
چمن حیات کو اور دل کو آشیاں کہیئے

وہ اولین نگہ جس سے ہو ادا مفہوم
اُسے نظر نہیں جذبات کی زباں کہیئے

رُخِ حسیں کا تصوّر اگر ہے زادِ سفر
خیالِ گیسوئے پیچاں کو کارواں کہیئے

بہار نام نہیں ہے تبسّمِ گُل کا
دِلوں پہ مُردنی چھائے تو پھر خزاں کہیئے

خوشی حباب کی مانند عارضی ہے شفیع
غمِ حیات کو اِک بحرِ بے کراں کہیئے



گوشہ ہائے دل میں پنہاں وہ ستم ایجاد ہے
جس کی چاہت میں ہماری زندگی برباد ہے

غم پہ غم ملتے گئے خاموش میں سہتا گیا
ظرف اپنا بے نیازِ شکوہ و فریاد ہے

ایک لمبی داستاں ہے ساغر و مینا کا ذکر
آنکھوں آنکھوں میں کہیں تو مختصر رُوداد ہے

اصل میں سمجھیں تو دونوں ایک ہی پرشاد ہیں
"میں خدا پرشاد ہوں اور کرشن پرشاد ہے"

خوش نصیبی سے جو تو پائے خودی میں بھی خدا
تو خودی پرشاد ہو کر بھی خدا پرشاد ہے

ہم بھی کہتے ہیں شفیعؔ اس رنگ میں اپنی غزل
یہ یہ دنیائے غزل میں اک نئی ایجاد ہے



کعبہ لئے ہوئے نہ کلیسا لئے ہوئے
دل ہے ترے خلوص کی دنیا لئے ہوئے

کس سادگی سے جانے وہ کیا کیا لئے ہوئے
آتے ہیں اک ہجومِ تمنّا لئے ہوئے

دشمن کی دوستی کا کریں کس طرح یقیں
کرتے ہیں قتل رنگِ مسیحا لئے ہوئے

ہوتی ہے کچھ عجیب سی اس دل کی کیفیت
آتے ہیں جب بھی وہ رُخِ زیبا لئے ہوئے

اُٹھوں گا میں نہ پاؤں گا جب تک شرابِ دید
بیٹھا رہوں گا سر میں یہ سودا لئے ہوئے

جاتا ہے کوئی کوچۂ جاناں میں بار بار
"اپنی نظر میں ذوقِ تماشا لئے ہوئے"

سوئیں تو ساتھ لے کے ستاروں کی انجمن
جاگیں تو آفتاب ہے تازہ لئے ہوئے

دل پر گزر رہی ہے قلم ہے رقمطراز
ہوتے ہیں اپنے شعر سلیقہ لئے ہوئے

پیتے ہیں ہم تو آنکھوں ہی آنکھوں میں اے شفیع
آتے ہیں کیوں وہ ساغر و مینا لئے ہوئے





سُنتے آئے ہیں مگر آج حقیقت دیکھی
آپ سے آنکھ مِلائی تو قیامت دیکھی

دل کی بستی کے اُجڑنے کا سماں کیا دیکھا
ساری دنیا کی بدلتی ہوئی حالت دیکھی

پتّے پتّے میں ترا جلوۂ پنہاں دیکھا
ذرّہ ذرّہ میں نمایاں تری صورت دیکھی

کل اندھیروں میں اُجالوں کی کِرن پھوٹی تھی
آج انوار پہ چھائی ہوئی ظُلمت دیکھی

ایک اِک دل پہ ترے عشق کے اَسرار کھُلے
"ایک اِک گھر پہ برستی ہوئی رحمت دیکھی

تم بھی غیروں کی طرح بہرِ عیادت آئے
خاک تم نے دلِ بیمار کی حالت دیکھی

اپنے ہر شعر میں آمد ہے روانی ہے شفیعؔ
ایک اِک شعر کے مضمون میں جدّت دیکھی



لگتا نہیں ہے دل جو گلستاں کے سامنے
وحشت میں گھومتا ہوں بیاباں کے سامنے

پائی ہے دل نے ہجر کے داغوں سے روشنی
"تارے خجل ہیں جشنِ چراغاں کے سامنے"

کیا آزما رہی ہے ہمیں گردشِ حیات
عزمِ جواں ہے آج بھی طوفاں کے سامنے

وہ سربلند ہے جو ترے در پہ جھک گیا
اب کیا جھکے گا وہ کسی انساں کے سامنے

مشہور آپ کی ہے مرصع غزل شفیع
ہم کیا کہیں گے ایسے غزل خواں کے سامنے



دل میرا اُداس آج سرِ شام بہت ہے
چہرہ شبِ فرقت کا سیاہ فام بہت ہے

مر جائیں تو اک رشتۂ بے نام بہت ہے
جینے کے لئے لب پہ ترا نام بہت ہے

آنکھوں نے سنائی تو ہے رودادِ غمِ دل
نظروں کا تکلّم سہی، ابہام بہت ہے

ساقی مجھے درکار نہیں شیشہ و ساغر
آنکھوں سے جو مِل جائے وہ اِک جام بہت ہے

ہاں شاعری ویسے تو بڑی چیز ہے لیکن
اِس دور میں یہ فن بھی تو بدنام بہت ہے

رُسوا ہیں بہت آج حسینانِ زمانہ!
اے عشق ترے سر یہی الزام بہت ہے

مضبوط نہ ہوں جس کے ارادے شفیع اقبال
وہ شخص رہِ زیست میں ناکام بہت ہے



حُسن کا فتنہ بپا ہے شہر میں
گلرُخوں کا جمگھٹا ہے شہر میں

جس کو دیکھو خود نما ہے شہر میں
آدمی بہروپیا ہے شہر میں

حُسن کی رنگیں اداؤں کی قسم
دل ہمارا کھوُ گیا ہے شہر میں

یوں تو سب ہیں ، ہمنوا کوئی نہیں
زندگی بے آسرا ہے شہر میں

دوستوں کی بے وفائی کا چلن
عام ہو کر رہ گیا ہے شہر میں

سینکڑوں تم سے حسیں، شعلہ جبیں
ایک ہی تو منچلا ہے شہر میں

دل تو اپنا بجھ گیا لیکن شفیعؔ
جسم اب بھی جل رہا ہے شہر میں



دل لگی ہے دل لگانا کیا؟
جان جانے کا ہے بہانا کیا

دِل کی دھڑکن ہی رُک نہ جائے کہیں
ہائے! ایسا بھی مُسکرانا کیا

غم ہی مِلتا ہے جب وہ مِلتے ہیں
ایسے لوگوں کے پاس جانا کیا

دِل کے اُجڑے ہوئے نشیمن کو
کوئی آسان ہے بسانا کیا

غم ہے جس کو نہیں نجات کبھی
ایسے مجبور کو ستانا کیا

ہجر میں کیا بتائیں کیا گزری
حالِ دل آپ کو سُنانا کیا

دل کو کیوں تکرمنا رہے ہو شفیع
مان جائے گا یہ دِوانہ کیا



تیرا ہم پہ کرم رہے ساقی
میکشی کا بھرم رہے ساقی

ساری خوشیاں تجھے نصیب ہوئیں
اپنے حصہ میں غم رہے ساقی

یوں تو ہر شئے سنور گئی لیکن
زُلف کے پیچ و خم رہے ساقی

عشق رسوا نہ ہو سرِ بازار
دل میں پنہاں صنم رہے ساقی

سارے میخوار فیضیاب ہوئے
صرف محروم ہم رہے ساقی

میری منزل کے رہنما بن کر
تیرے نقشِ قدم رہے ساقی

مست آنکھوں سے پی رہا ہے شفیعؔ
تیری چشمِ کرم رہے ساقی



ذہن میں یاد کا سیلاب جو آیا ہوگا
ریت پر لکھ کے مرا نام مٹایا ہوگا

ہر طرف حُسن کی تنویر نظر آتی ہے
شائد اب عشق کی دنیا میں سویرا ہوگا

ذہن کی جھیل میں کھِلنے لگے یادوں کے کنول
شیشۂ آب پہ پتھّر کوئی مارا ہوگا

یوں نہ لُٹتی مری دنیائے محبّت یارو
"میری تخریب میں اُن کا بھی اِشارہ ہوگا"

نوکِ مژگاں پہ چمکتے ہوئے اشکوں کے دیئے
جشنِ فرقت کسی بیکس نے منایا ہوگا

زندگی اپنی فقط کربِ مسلسل ہے شفیعؔ
کیا یہی روپ ہر انسان کو بھایا ہوگا



چشمِ گریاں کی دُعا، زُلفِ پریشاں کی دُعا
تم نے مانگی تو نہیں موسمِ باراں کی دُعا

ہم نے مانگی ہے فقط دردکے درماں کی دُعا
کوئی مانگی تو نہیں تختِ سُلیماں کی دُعا

دامنِ دل نہ بچا دستِ جنوں کی زد سے
پھر بھلا کون کرے جیب و گریباں کی دُعا

ہاتھ اُٹھائے تو ہیں اکثر ہی دُعا کی خاطر
کی نہیں ہم نے کبھی اپنے دل و جاں کی دُعا

اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے ساغر زاہد
میں نے مانگی ہے ہمیشہ ترے ایماں کی دُعا

ہم نے مانگی ہے شفیعؔ فرطِ جنوں میں اکثر
قلبِ سوزاں کی دُعا، چاک گریباں کی دُعا



بُت پرستی، مئے کشی اور حُسن و رنگیں شباب
بن گیا ہے تبکدہ دل، اے دلِ خانہ خراب

عشق ہے صحرا نوردی، اک تلاش اور جستجو
حُسن کی جلوہ گری ہے خوبصورت اِک سراب

تو عروسِ شب ہے گویا چاندنی راتوں کا نور
تیری ہستی اِک مجسّم، تیری صورت ماہتاب

اِک حقیقت ہو گیا تیرے تصوّر کا جہاں
میری دنیا، میری ہستی بن گئی ہے جیسے خواب

زاہد و ناصح کی باتیں کون سمجھے گا شفیع
اُف یہ موسم، یہ فضائیں، یہ گھٹائیں یہ شراب



جو دیکھی ظاہری رونق تو پتھر کو نگیں پایا
جسے ہم دوست سمجھے اُسکو مارِ آستیں پایا

جو اپنا جانِ جاں ہے، ماحصل ہے زندگانی کا
اُسی اک مہِ یاں کو خانۂ دل میں مکیں پایا

ہزاروں نازنیں دیکھے، ہزاروں مہ جبیں دیکھے
مگر تم سا حسیں کوئی زمانے میں نہیں پایا

حیاتِ ابنِ آدم اک حبابِ آب ہے گویا
"خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے تر جبیں پایا"

ہم اہلِ ظرف ہیں، خود دار ہیں، احساس رکھتے ہیں
ہمیں دنیا نے بس اِس واسطے گوشہ نشیں پایا

مزاجِ دل ہمارا فطرتِ شبنم کا حامل ہے
تجھے اے جانِ جاں، شعلہ بدن شعلہ جبیں پایا

لٹا دی ہم نے اپنی کائناتِ زندگی لیکن
کسی دلدار کا ہم نے شفیعؔ اِک دل نہیں پایا



تیرے عارض کے مہکتے ہوئے رنگین گلاب
چھین لیتے ہیں مرے قلب کی تسکین گلاب

زینتِ حسن بنیں، جو ترے جوڑے میں ٹکیں
ہاں وہی ہوتے ہیں بس قابلِ تحسین گلاب

تیری قامت ہے لچکتی ہوئی ڈالی گل کی
تیری صورت ہے مہکتا ہوا رنگین گلاب

حسنِ خوباں کی زمانے میں نہیں کوئی مثال
حسنِ خوباں کے لئے باعثِ توہین گلاب

ایسے مہکے ہے تیری یاد کی خوشبو دل میں
جیسے چپکے سے کھلیں باغ میں دو تین گلاب

ایک اک لفظ ہے پتّوں پہ چمکتی شبنم
ایک اک شعر ہے کھلتا ہوا زرّین گلاب



کسی کو گوشۂ دل میں بٹھا رہا ہوں میں
خیال و خواب کی دنیا بسا رہا ہوں میں

مٹا کے سارے نقوشِ منافرت یکسر
دلوں میں دردِ محبّت جگا رہا ہوں میں

لہر لہر پہ مرا نام ثبت ہو جائے
بھنور بھنور سے نگاہیں ملا رہا ہوں میں

غموں کے ساز پہ نالوں کی لَے کو اپنا کر
"دونئ حیات کے نغمے سُنا رہا ہوں میں"

تری جُدائی میں جو گیت میں نے گائے تھے
تجھی کو بزمِ طرب میں سُنا رہا ہوں میں

"خوش آمدید" چلے آیئے مرے دل میں
تمھاری راہ میں آنکھیں بچھا رہا ہوں میں

حیات اپنی کچھ ایسے گزر رہی ہے شفیعؔ
گھروندا ریت کا جیسے بنا رہا ہوں میں



دھارے تھے اپنے آپ پہ جس نے خدا کے روپ
کتنے بدل گئے ہیں اُسی پارسا کے روپ

چہرے ہیں گرد پوش، بدن ہیں خطا کے روپ
شہروں میں کیا ملیں گے تمہیں آشنا کے روپ

ہم نے ردائے عشق میں چہرہ چھپا لیا
دیکھے گئے نہ حُسن کے، ناز و ادا کے روپ

خوشبو ترے بدن کی، مرے دِل کی دھڑکنیں
بن جائیں دونوں ایک انوکھی وفا کے روپ

صحرائے دل میں آپ کی یادوں کے قافلے
اب تک بھٹک رہے ہیں کسی بد دعا کے روپ

نیچی نِگاہ، شرم، دبی مسکراہٹیں
دیکھے ہیں کیسے کیسے تری اِلتجا کے روپ

تنہائی، یاد، کربِ مسلسل، گھٹن گھٹن
تجھ سے بچھڑ کے پائے ہیں کتنے سزا کے روپ

اُس بے وفا کے شہر ہیں پتھراؤ ہے شفیعؔ
ڈھونڈو نہ دل کی راہ میں جنسِ وفا کے روپ





شائد اب تو ایسا ہوگا ۔ عشق بھی اپنا رُسوا ہوگا
آنکھیں اُسکی بھر آئی ہیں ۔ ساغر کوئی چھلکا ہوگا
جھُوم کے برسا بادل بادل ۔ آنچل آنچل بھیگا ہوگا
کِس کے دل کو ٹھیس لگی ہے ۔ کون بھلا یہ سوچا ہوگا
بہہ جائیں تو اشکِ پیہم ۔ قطرہ قطرہ دریا ہوگا
مجھُ سے بچھڑ کے چپکے چپکے ۔ تو بھی آخر رویا ہوگا
پیار کے گہرے ساگر میں کیا ۔ ڈوب کے کوئی اُبھرا ہوگا
دل کو توڑا اُس نے لیکن ۔ رہ رہ کر پچھتایا ہوگا
ساکت جھیل میں ہلچل کیوں ہے ۔ پتھر کوئی پھینکا ہوگا
چہرہ پڑھ کر ملئے شفیعؔ سے
ورنہ آپ کو دھوکا ہوگا



ارماں کو مرے دل کے نہ پامال کئے جاؤ
جانا ہو تو چپکے سے سبک گام چلے جاؤ

روٹھے ہوئے آئے ہو نہ روٹھے ہوئے جاؤ
اِک پیار کا احساس تو ہمراہ لئے جاؤ

ہر گام پہ اِک جھوٹ کا بازار کھلا ہے
سچ بولنا جو چاہو تو مقتل میں چلے جاؤ

غیروں پہ بھی الطاف و کرم، ہم سے بھی اُلفت!
ہر شخص کو اس طرح سے دھوکا نہ دیئے جاؤ

مرنا کسی انسان کے بس میں تو نہیں ہے
جینا ہو تو سائے میں صلیبوں کے جیئے جاؤ

تم اپنی ملاقات کے اوقات بدل دو
جب صبح چلے آؤ تو پھر شام ڈھلے جاؤ

خود کو نہ کرو دفن اندھیروں کی لحد میں
تم تیرگی میں نور کی دیوار چنے جاؤ

غم سب کے لئے شاملِ حالات رہا ہے
غم کو تو بہر حال، بہر طور سہے جاؤ

بیساکھیاں بنتی نہیں شہرت کا سہارا
دیکھو نہ کسی اور کو تخلیق کئے جاؤ

جس شہرِ بتاں میں شفیع اقبال ہو موجود
اُس شہر کے ہر بُت کو خبردار کئے جاؤ





یہاں بھی ظلم روا ہے یہاں سے بھاگ چلو
ہر ایک شخص خدا ہے یہاں سے بھاگ چلو

کسی کے حکم کے تابع ہر ایک قطرۂ آب
کسی کے بس میں ہوا ہے یہاں سے بھاگ چلو

یہاں دلوں پہ ابھی نفرتوں کا پہرہ ہے
درِ فرار کھلا ہے یہاں سے بھاگ چلو

وہی کہ جن کی مسیحائی ہم نے کی یارو
انہیں سے درد ملا ہے یہاں سے بھاگ چلو

خود اپنے سائے میں ضم ہو نہ جائیں آپ شفیع
اندھیرا پھیل چلا ہے یہاں سے بھاگ چلو



نرم و گداز، پھول سا نکھرا ہوا بدن
سورج کی روشنی میں جھلستا رہا بدن

گو منجمد تھی برف کی مانند زندگی
حالات کی تپش میں پگھلتا رہا بدن

تاریکیوں میں ذہن کے محراب جل اٹھے
ہر شعر بن گیا مرے احساس کا بدن

پھیلے جو ہم تو بن گئے ساگر کی وسعتیں
سمٹے تو ایسے جیسے کوئی سیپ کا بدن

بکھری ہوئی ہیں قلب کے شیشے کی کرچیاں
بے حس پڑا ہے خاک کا ٹوٹا ہوا بدن

آنکھیں کھلی ہوئی ہیں مگر دیکھتی نہیں
ہر بات جان لیتا ہے سویا ہوا بدن

چہرے سب ایک سے ہوئے اس شہر میں شفیع
لاکھوں کی بھیڑ میں بھی اکیلا رہا بدن



ہر پل یونہی لہرائے تری یاد کا آنچل
جب ذہن پہ چھا جائے تری یاد کا آنچل

حالات کی آندھی جو اُسے کھینچنا چاہے
سینے سے لپٹ جائے تری یاد کا آنچل

دامن میں سمیٹے ہوئے اِک درد کا صحرا
ہر سمت نظر آئے تری یاد کا آنچل

اِس شہرِ تمنّا میں کہیں دھوپ سا چمکے
سایہ کہیں پھیلائے تری یاد کا آنچل

ویرانۂ گلشن میں، کبھی صحنِ چمن میں
ہر شکل میں ڈھل جائے تری یاد کا آنچل

اُبھرے جو تصوّر میں ترا حُسنِ مجسّم
چہرے پہ بکھر جائے تری یاد کا آنچل

جب جب میں تجھے بھولنا چاہوں شفیع اقبال
سو طرح سے بل کھائے تری یاد کا آنچل



اُفق کی سرحدوں پر روشنی تقسیم ہوتی ہے
اُجالے کی کرن سے تیرگی تقسیم ہوتی ہے

سُنا ہے تیری محفل میں کوئی پیاسا نہیں رہتا
مگر دیکھا! یہاں تو تشنگی تقسیم ہوتی ہے

سراپا غم ترا شاداب پیکر بن گیا لیکن
لبوں کے دو کناروں پر ہنسی تقسیم ہوتی ہے

تمھاری بزم میں ہر شخص کا یکساں نہیں رتبہ
بقدرِ خود نمائی دلبری تقسیم ہوتی ہے

تری یادوں کے جلوے تیرگی کو روشنی بخشیں
اُسی لمحے تو میری زندگی تقسیم ہوتی ہے

اگر غم بانٹنا ٹھہرا تو اس طرح وہ غم بانٹیں
کہ جیسے دردمندوں میں خوشی تقسیم ہوتی ہے

بنامِ فن شفیعؔ اب تو یہاں افکار بکتے ہیں
ہمارے شہر میں یوں شاعری تقسیم ہوتی ہے



خوشیوں کے ساتھ غم بھی مری داستاں میں ہے
دوشیزۂ بہار بھی شاملِ خزاں میں ہے

کچھ اس طرح وہ انجمنِ گل رُخاں میں ہے
جیسے کوئی گلاب کسی گلستاں میں ہے

تم ہی تو مہ جبین ہو، تم ہی ہو گلبدن
شہرت تمھارے حُسن کی سارے جہاں میں ہے

پلکوں کی چلمنوں کو اُٹھا کر نہ دیکھئے
یہ تیرِ نیم کش ہی مرے جسم و جاں میں ہے

شیرینی، حُسن، لوچ، لطافت، شگفتگی
خوبی ہر ایک طرح کی اُردو زباں میں ہے

یادوں کی ناؤ ذہن کے ساگر میں کھو گئی
چہروں کی بھیڑ دل کے اندھیرے مکاں میں ہے

جس کی تلاش شہرِ نگاراں میں تھی شفیع
وہ بے وفا کہیں پہ انہیں مہ وشاں میں ہے



آنکھیں پُرنم
بھیگا موسم

کالی گھٹائیں
زُلفِ برہم

دریا دریا
اشکِ پیہم

حُسن کا جادو
عالم عالم

شعلۂ تر ہے
حُسنِ مجسّم

میرا غم ہے
دنیا کا غم

دردِ انساں
جذبۂ گوتم

دل کی باتیں
مبہم مبہم

آخرِ شب ہے
درد بھی کم کم

حُسن کی شوخی
عشق کا ماتم

کتنے صحیفے
درہم برہم

روندی گئی ہے
عظمتِ آدم

شعرِ شفیع کے
شعلہ و شبنم





تلاشی ہے سمندر میں ہمیشہ تشنگی میں نے
کہ صحراؤں میں دیکھی ہے کبھی بہتی ندی میں نے

اُجالے بانٹنے آئے اندھیروں کے مکیں لیکن
مسلّط ہوتے دیکھی ہے اُنہیں پر تیرگی میں نے

تراشا لمحہ لمحہ وقت کی سنگیں چٹانوں کو
"بڑی مشکل سے کاٹی ہے سزائے زندگی میں نے"

کہ جس کی لَو سے احساسِ وفا بھی جل اُٹھے اکثر
وہی اِک بات تیرے قرب میں محسوس کی میں نے

شفیعؔ اقبال کو دیکھا ہے سارے شہر نے لیکن
اُسے پرکھا ہے، جانچا ہے تجھی کی دوستی میں نے



احساسِ قرب دل میں جگاتی ہیں سردیاں
ٹھنڈے بدن میں آگ لگاتی ہیں سردیاں

شعلوں کو برف برف بناتی ہیں سردیاں
رگ رگ میں زندگی کی سماتی ہیں سردیاں

بکھرے قدم قدم پہ نکھرتے ہوئے سے ہیں
ہر راستے میں پھول کھلاتی ہیں سردیاں

باہوں کے درمیاں یا سراپا لباس میں
اُن کے بدن کو خوب چھپاتی ہیں سردیاں

یادوں کی آنچ دل کے کناروں کو چھو گئی
برہا کی رات مجھ کو جلاتی ہیں سردیاں

سرمایہ دار عیش و طرب ڈھونڈتے رہیں
مفلس کو لمحہ لمحہ ستاتی ہیں سردیاں

لپٹی ہوئی ہے دھند میں ہر شام اے شفیع
صبحوں کو شبنمی سی بناتی ہیں سردیاں



ملتے ہیں گام گام ہزاروں ستم ابھی
باقی ہے جن سے رونقِ دیر و حرم ابھی

دل میرا حُسنِ ذات کے سانچے میں ڈھل گیا
سایہ میرے وجود کا ہوتا ہے ضم ابھی

آئیں گے دل کی راہ میں کچھ اور حادثات
کچھ اور آزمائیں گے دنیا کے غم ابھی

مئے کی بجائے ساغرِ زہراب دیجئے
"شائد غمِ حیات میں تلخی ہے کم ابھی"

اُن کی نگاہِ ناز نے دیوانہ کر دیا
ہوتا ہے کتنا دیکھئے لطف و کرم ابھی

باتیں ہزار اُن سے ہوئیں ہیں مگر شفیعؔ
ہر بات پھر بھی جیسے ہوئی ہے مبہم ابھی



لمحہ لمحہ وقت کے ہاتھوں اسیرِ دام ہے
زندگی اب زندگی کے نام پر الزام ہے

ایک سناٹا سا ہر سو جسم کے جنگل میں ہے
خامشی ہی خامشی، آرام ہی آرام ہے

کس کے در پر جا کے دستک دیں کہ سارے شہر میں
پتھروں کے جسم ہیں، بے چہرگی اب عام ہے

سر لٹکتے ہیں ہر اک شاخِ شجر پر آجکل
زندگی حاتم کا قصہ یا فقط اوہام ہے

چاٹ لیتی ہے زمیں کا خون سورج کی نظر
ذرہ ذرہ دامنِ دریا کا تشنہ کام ہے

جس کے شعر و فن کا چرچہ ملک بھر میں ہے شفیعؔ
ہاں وہی شاعر ابھی تک شہر میں گمنام ہے



ساگر کوئی پھیلا ہوا تا حدِّ نظر ہے
ہر ریت کے ٹیلے پہ ہر اِک شخص کا گھر ہے

اِک آئینہ خانہ میں سجائے گئے اصنام
پھر آئینہ خانہ ہے نہ دیوار نہ در ہے

وہ شخص جو ہر لمحہ میرے ساتھ رہا ہے
تنہائی میں دیکھوں تو اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

اِحساس کے تاروں کو چھُوا جائے نہ ہرگز
پھر درد کی جھنکار کے چھڑ جانے کا ڈر ہے

پھر سے مہک اُٹھے ہیں خیالوں کے دریچے
آباد پھر اِک بار ہوا دل کا نگر ہے

جذبات کا طوفاں ہے مقابل شفیع اقبال
دل ہے وہی آنکھیں ہیں سمندر ہے بھنور ہے



شر پسندوں کے خیالات سے زِچ ہیں ہم لوگ
اُن کے مخصوص مفادات سے زِچ ہیں ہم لوگ

خوف و دہشت زدہ حالات سے زِچ ہیں ہم لوگ
فرقہ وارانہ فسادات سے زِچ ہیں ہم لوگ

کتنے مارے گئے اور کتنے ہوئے ہیں زخمی
ایسے دل سوز سوالات سے زِچ ہیں ہم لوگ

کتنے عرصے سے لگا ہے یہاں کرفیو یارو
اپنے ہی گھر کی حوالات سے زِچ ہیں ہم لوگ

کوئی کرتا نہیں اقدام، فقط کہتے ہیں
رہنماؤں کے بیانات سے زِچ ہیں ہم لوگ

کوئی جذبات اُبھارے کوئی پتھر پھینکے
ایسی بیکار کی روایات سے زِچ ہیں ہم لوگ

گھر سے نکلیں تو شفیعؔ لوٹ کے آنا مشکل
شہر کی ایسی مدارات سے زِچ ہیں ہم لوگ

(انور رشید کے انتقال پر اُسی کے لب و لہجہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے) اگسٹ ۸۵ء



کھُردرا لہجہ تھا اُس کا یہ برابر کہنا
ایک شاعر تھا وہ اچھا یہ برابر کہنا

اُس کے افسانے حقیقت تھے، فسانے بھی مگر
اُس کا انداز تھا تیکھا یہ برابر کہنا

مِٹ گیا شعر و ادب اور قلم کی خاطر
لوحِ ہستی پہ کبھی تھا یہ برابر کہنا

جینا سیکھا ہی نہیں کیسے جیئے گا آخر
ایک قرض اُس نے چُکایا ہے برابر کہنا

جیتے جی کوئی بھی کھینچا نہ اُسے اپنے قریب
موت کے بعد ڈھنڈورا، یہ برابر کہنا



پھول زخموں کے نہ دامن میں سمیٹا کیجے
کرچیاں اپنی انا کی نہ بکھیرا کیجے

جن کو خود اپنے سوا کچھ بھی نظر آ نہ سکے
ایسے احباب کی محفل میں نہ بیٹھا کیجے

دیکھ لیجے اُمڈ آئے ہوئے طوفان کا رُخ
کبھی چڑھتے ہوئے دریا میں نہ اُترا کیجے

عزم محکم ہو تو بڑھئے یونہی منزل کی طرف
چلتے چلتے کبھی رستے میں نہ ٹھہرا کیجے

مجھ کو مدہوش نہ کر دے کہیں چاہت کا خمار
ایسی مخمور نگاہوں سے نہ دیکھا کیجے

آپ کے رُخ کو چھپائی ہوئی زُلفیں توبہ
اب تو آنچل کو ہٹا دیجے، سویرا کیجے

دل کے جذبات کی تصویر اگر دیکھنی ہو
گاہے گاہے شفیع اقبال کو دیکھا کیجے



یہ بے رُخی مگر آپ کی کوئی خطا نہیں
چلیئے! ہمیں بھی آپ سے کوئی گِلہ نہیں

جنگل تمام آگ کے شعلوں میں گھِر گیا
ہر شخص بدگماں ہے کوئی بولتا نہیں

مہر و وفا کی بات کریں کس سے ہم کریں
شہرِ وفا میں کوئی بھی اہلِ وفا نہیں

اُن کی تمام مصلحتیں فاش ہو گئیں!
اب رسمِ دل لگی کا کوئی سلسلہ نہیں

ہر پیکرِ جمال بھی ہرجائی ہو گیا
حیرت ہے دردِ دل کی یہاں بھی دوا نہیں

چھایا ہوا جہاں یہ خدائے بسیط ہے
لیکن ہمارے سامنے کوئی خدا نہیں

دل سے جو نکلے بات شفیعؔ با اثر رہے
لب پر ہمارے اب کوئی ایسی دعا نہیں



مخمور ان نگاہوں سے اتنا نہ دیکھیے
لبریز ہو گیا مرا پیمانہ دیکھیے

جن کے تمام ظلم و ستم کا ہے تذکرہ
پڑھنے لگے ہیں خود وہی افسانہ دیکھیے

مرتا رہا ہے آپ پہ، کیسے جیئے گا وہ
"کس حال میں ہے آپ کا دیوانہ دیکھیے"

چہرے پہ مسکراہٹیں، دل میں حسد کی آگ
انسانیت کے ظرف کا پیمانہ دیکھیے

نظریں جھکائیں، دانت میں آنچل دبا لیا
اندازِ دلربا کا پشیمانہ دیکھیے

جن کو سمجھ رہے تھے سبھی پارسا شفیع
اُن کا سرورِ مستیٔ رندانہ دیکھیے



لمحۂ انتخاب ہے گویا
حُسن کا احتساب ہے گویا

راستے اس طرح ہوئے روشن
ہم سفر ماہتاب ہے گویا

زخم پاتے ہیں اس طرح ترتیب
زندگی اِک کتاب ہے گویا

آنسوؤں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا
وقت اتنا خراب ہے گویا

لمحہ لمحہ ہے ڈائری میں رقم
حادثوں کا حِساب ہے گویا

آپ کا مُسکرا کے رہ جانا
آمدِ اِنقلاب ہے گویا

اپنے سائے سے ڈر رہا ہوں شفیعؔ
سر پہ شہرِ عذاب ہے گویا



غم کے طوفان میں ہنستے رہے گھر کر ہم لوگ
آگ کے دریا سے آئے ہیں گزر کر ہم لوگ

ہم جو چاہیں تو سمندر میں بھی جادہ کرلیں
عہدِ حاضر کے ہیں دارا و سکندر ہم لوگ

اہلِ کردار ہیں، احساسِ انا رکھتے ہیں
کیوں نہ ہوں عظمتِ انسان کا پیکر ہم لوگ

اپنے ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے کشکولِ انا
اپنے ہی شہر میں ہیں، جیسے گداگر ہم لوگ

ڈھونڈتے پھرتے ہیں بونوں کے جزیرے میں شفیع
قدِ آدم کوئی آئینہ برابر ہم لوگ



یوں تصوّر میں کوئی رشکِ جمال آتا ہے
جیسے میخوار کے شیشے میں خیال آتا ہے

اپنے بیگانے ہوئے، غیر نے چاہا ہم کو
اب کہاں اپنے پرائے کا سوال آتا ہے

کس کو ملتا ہے ہمیشہ کے لئے بامِ عروج
دوپہر ہوتے ہی سورج کو زوال آتا ہے

لوگ اس دور میں ہر وقت ہیں مصروفِ نشاط
کون اب پوچھنے غمخوار کا حال آتا ہے

ہم نے محفوظ بہت اپنی انا کو رکھا
کیونکہ شیشے میں، بس اِک چوٹ سے بال آتا ہے

جب چٹکتی ہوئی کلیوں کو چمن میں دیکھوں
تیری شوخی، تِری رنگت کا خیال آتا ہے

شعر کہنا بہت آسان سمجھتے ہو شفیعؔ
عرق ریزی ہو تو پھر فن میں کمال آتا ہے



زباں بدلی، بیاں بدلا، شعورِ فکر و فن بدلا
مزاجِ شاعری بدلا کہ اندازِ سخن بدلا

ہمالہ نے جھکایا سر، زمیں دہلی، گگن بدلا
ہمارے عزم کے آگے رُخِ گنگ و جمن بدلا

تصادم ہو گیا فرقوں میں اُن کا حُسنِ ظن بدلا
"حرم کی جب فضاء بدلی، مزاجِ برہمن بدلا"

ہمارے مصلحت اندیش واعظ کا چلن بدلا
وہی باطن مگر ظاہر میں اُس کا پیرہن بدلا

محبّت کے رواجوں کا جو اندازِ کہن بدلا
تمھاری شوخیاں بدلیں، ہمارا بانکپن بدلا

کہاں کی دوستی ناصح، زمانے کا چلن بدلا
تری دانشوری بدلی، مرا دیوانہ پن بدلا

نگاہِ ساقیا بدلی، نظامِ انجمن بدلا
شفیعؔ اقبال نے پھر بھی نہ اپنا حُسنِ ظن بدلا



خوشی جو بانٹتے پھرتے رہے سبھی کیلئے
تمام عمر ترستے رہے خوشی کیلئے

غمِ حیات کا زہراب پی کے زندہ ہیں
"چلے ہیں جانبِ میخانہ خودکشی کیلئے"

ہمارا شہر بھی شہرِ عذاب جیسا ہے
بڑا کٹھن ہے یہاں جینا آدمی کیلئے

کئے ہیں لاکھ جتن ہم نے تم سے ملنے کے
بہانے تم نے کئے کتنے بے رُخی کیلئے

ہر ایک شخص کو دِل میں مقام دیتا ہے
ہمارا شہر تو جنّت ہے اجنبی کیلئے

ہمیں بُلایا ہے محفل میں شعر کہنے کو
چلو وہاں بھی شفیع آج شاعری کیلئے



خانہ بدوش ہو کے چلے اپنے گھر کے ساتھ
سورج بھی چل رہا ہے ہمارے سفر کے ساتھ

حسن و شباب اُن کا جلا دے نہ جسم و جاں
اچھی نہیں ہے چھیڑ یہ برق و شرر کے ساتھ

شعر و ادب کے چاہنے والے کہاں گئے؟
بزمِ سخن بھی اُٹھ گئی اہلِ نظر کے ساتھ

محفل میں تیرے آنکھ اُٹھانے کی دیر تھی
کتنے سوال اُٹھے تری اِک نظر کے ساتھ



اپنے تعلقات تو سب سے بڑھا کے دیکھ
مخلص ہے کون کتنا ذرا آزما کے دیکھ

تجھ میں کہاں ہے تابِ نظر دیدِ یار کی
ہو دیکھنا تو اُسکو تصوّر میں لا کے دیکھ

اوڑھے ہوئے ہیں مصلحتوں کے نقاب لوگ
سچائی دیکھنا ہے تو پردہ اُٹھا کے دیکھ

کھوٹے کھرے کی اب کہاں پہچان ہے یہاں
کھوٹا اگر ہے شعر کا سِکّہ، چلا کے دیکھ

انساں، تجھ کو دُور خلاؤں میں کیا مِلا؟
دل میں کسی غریب کے اِک گھر بنا کے دیکھ

جینے کا تجھ کو جب ہی مزہ آئے گا شفیع
انسانیت کے درد کو دل میں بسا کے دیکھ



منجمد ہو گئے افکار تو پھر کیا ہوگا
ہم نہ کہلائیں قلم کار تو پھر کیا ہوگا

اختلافات کا اچھا نہیں پیدا ہونا
ہاتھ میں آ گئی تلوار تو پھر کیا ہوگا

جان کی بھی نہیں قیمت کوئی اُس کے آگے
"لُٹ گئی دولتِ کردار تو پھر کیا ہوگا"

اِک جھلک اُس نے دکھائی تو مرے ہوش اُڑے
روبرو ہو وہی دلدار تو پھر کیا ہوگا

ہم نے الفاظ کو بویا ہے زمینوں میں شفیع
خوب اُگنے لگیں اشعار تو پھر کیا ہوگا



وہ جب کبھی بھی مرے دل کے پاس آئے ہیں
خلوص و پیار کی خوشبو بھی ساتھ لائے ہیں

جنھیں کنویں میں اُترنے کا بھی شعور نہ تھا
وہ کہہ رہے ہیں سمندر میں تیر آئے ہیں

ہمیں نے تم کو دیا ہے سلیقہ جینے کا
ہمیں سے کہتے ہو اپنے نہیں پرائے ہیں

ہمیں نہیں ہے کوئی خوف دھوپ چھاؤں کا
"ہمارے سر پہ تمہاری رحمتوں کے سائے ہیں"

قدوں کی بات کہاں چھیڑ دی شفیع تم نے
جو چھوٹے قد کے ہیں، لمبے انہیں کے سائے ہیں



اُس ایک شخص کا اب تک ہے انتظار مجھے
کیا ہے جس کی محبت نے باوقار مجھے

وفا کی آگ نے کندن بنا دیا ہے مگر
"غمِ حیات ذرا اور بھی نکھار مجھے"

میں اُس جگہ ہوں جہاں سے پلٹنا مشکل ہے
مری حیات، نہ پیچھے سے اب پکار مجھے

میں اپنے عزم و عمل پر یقین رکھتا ہوں
ملی ہیں راہیں ہمیشہ ہی خار زار مجھے

متاعِ دل کو لٹایا ہے میں نے غیروں میں
نہیں سنبھال کے رکھنے کا اختیار مجھے

خزاں نے میری اُمیدوں کے پھول مہکائے
قدم قدم پہ کھلتی رہی بہار مجھے

طرح میں شعر تو کہہ لوں مگر شفیع اقبال
خیال ملتے ہیں اکثر ہی مستعار مجھے



نقوشِ پا نہ منزل کا نشاں ہے
گھُرا لو منظر ہے، دھواں ہے

لُٹائے دوسروں پر اپنا سب کچھ
جہاں میں اب کوئی ایسا کہاں ہے

سطح پر ذہن کے چھائی ہے پستی
خیالوں کا بہت اونچا مکاں ہے

نہ جانے حشر کیا ہو قافلے کا
"جسے دیکھو امیرِ کارواں ہے"

وطن کی آبرو لُٹنے نہ پائے
نگہباں خود شریکِ دشمناں ہے

معلّق ہو گئی ہے زندگی اب
زمیں نیچے نہ سر پر آسماں ہے

شفیعؔ اقبال کیا کہتے کسی سے
نہ جانے کیوں وہ ہم سے بدگماں ہے



دیوار و در ہیں سرد، عمارات سرد سرد
کہرے میں ڈوبتے ہوئے دن رات سرد سرد

ٹھنڈی ہوا بھی چبھنے لگی ہے بدن کو اب
ہاتھوں میں لگ رہا ہے کوئی ہات سرد سرد

خونریزیوں کا شہر میں بازار گرم ہے
انسانیت کے ہو گئے جذبات سرد سرد

میرے ہر اک سوال پہ چپ ہو گئے وہ کیوں
کیا ہو گئے ہیں اُن کے جوابات سرد سرد

مانا کہ ہے مزاج بہت اُن کا تُند و تیز
لیکن عجب ہے لہجہ، ہر اک بات سرد سرد

اب جذبۂ خلوص میں گرمی کہاں رہی
ملتے تو ہیں سبھی سے، ملاقات سرد سرد

موسم ہے خوشگوار مگر کیا کریں شفیع
فرقت میں کٹ رہے ہیں یہ دن رات سرد سرد



ہر اک چہرہ بظاہر پارسا ہے
کوئی مجرم پسِ پردہ چھپا ہے

جھروکے سے ذرا پردہ ہٹا ہے
کہ کوئی ماہِ نو پھر جھانکتا ہے

مقدّر سر پٹکنا کیوں مرا ہے
"سمندر ساحلوں سے پوچھتا ہے"

اُسی کو اہلِ محفل نے بھلایا
ادب کو خونِ دل جس نے دیا ہے

خیالوں کو اگر لفظوں میں بھر دوں
تو لہجہ خود بہ خود پھر بولتا ہے

مرے گھر کی ہمیشہ خانہ جنگی
کواڑوں سے پڑوسی دیکھتا ہے

دریچے ذہن کے کھلنے لگے ہیں
شعورِ آگہی پیدا ہوا ہے

تراشا ہے ہنرمندوں نے جس کو
وہی پتھر ادب کا دیوتا ہے

یہ کس نے کہہ دیا بزمِ سخن میں
شفیع اقبال کا لہجہ نیا ہے





ہم خلاؤں سے اُبھر کر آسماں ہو جائینگے
ذرّہ ذرّہ بن کے بکھریں گے جہاں ہو جائینگے

یہ نہ سوچا تھا کہ جنگل بھی بسیں گے اسطرح
صحرا، ٹیلہ ٹیلہ، سب مکاں ہو جائینگے

ریت کی دیوار کا سایہ کیسے ہو گا نصیب
وقت کے ہاتھوں گھروندے بے نشاں ہو جائینگے

نفرتوں کی یہ سُرنگیں پھونک دیں گی بستیاں
اِک دھماکے سے سمندر بھی دُھواں ہو جائینگے

ایسے چہرے جو کہانی کے اہم کردار ہیں!
جو نہی بدلے ایک منظر داستاں ہو جائینگے

شیشۂ جامِ انا کو ٹھیس پہنچائی تو پھر
آپ کے احسان بھی دل پر گراں ہو جائینگے

روز و شب کی زندگی کے مسئلے اپنے شفیع
کیا پتہ تھا بڑھتے بڑھتے جسم و جاں ہو جائینگے



مَرنے کا تصوّر بھی خطرناک نہیں ہے
اَب حادثہ کوئی بھی اَلمناک نہیں ہے

کچھ مصلحتیں پاؤں کی زنجیر بنی ہیں
اَب راہِ عمل میں کوئی بیباک نہیں ہے

ہنسنے کو زمانہ تو ہر اِک بات پہ ہنس دے
دکھ درد میں اِک آنکھ بھی نمناک نہیں ہے

وہ لوگ جو تہذیب کے دلدادہ رہے ہیں
اُن ہی کے بدن ڈھانکنے پوشاک نہیں ہے

رہبر ہیں، معلّم ہیں، سمجھدار ہیں لیکن
اِک اپنی اَنا کا اُنہیں اِدراک نہیں ہے

کچھ اپنا تسلّط بھی زمانے پہ شفیعؔ ہو
ویسے بھی اِرادہ مِرا ناپاک نہیں ہے